نظامِ زندگی میں

"دِین ومذہب"

کی واقعی اہمیت اور حقیقی قدر ومقام

دین ومذہب کا جامع تعارف، اس کی غیر معمولی اہمیت و معنویت، بے دینی اور دین بے زاری کی موجودہ یلغار کا اصل پس منظر، عصری الحاد کے اسباب و نتائج اور اس کے سدباب کے مفید اور پائیدار تدابیر، اس حوالے سے موجودہ معاشرے کا سنجیدہ تجزیہ وجائزہ۔ یہ اور اس موضوع سے متعلق اہم مسائل پر ایک پُر مغز، سنجیدہ اور علمی تحریر، جو فکرمند مسلمان کی ضرورت اور مسلمان گھرانے کی زینت ہے۔

مؤلف

مفتی عُبَیدُالرحمٰن صاحب مردان

رئیس دار الافتاء والارشاد، مردان

تاثرات

حضرت مولانا سید حبیب اللہ شاہ حقانی صاحب زِید مجدہم

مدرس ونگران شعبہ تخصص فی الدعوۃ والارشاد جامعہ دار العلوم حقانیہ، اکوڑہ خٹک

مکتبہ دار التقویٰ مردان

0300-9326101,0314-3017364

نظامِ زندگی میں

"دِین ومذہب"

کا حقیقی قدر ومقام

دین ومذہب کا جامع تعارف، اس کی غیر معمولی اہمیت ومعنویت، بے دینی اور دین بے زاری کی موجودہ یلغار کا اصل پس منظر، عصری الحاد کے اسباب ونتائج اور اس کے سدباب کے مفید اور پائیدار راستے، اس حوالے سے موجودہ معاشرے کا سنجیدہ تجزیہ وجائزہ۔ یہ اور اس موضوع سے متعلق اہم مسائل پر ایک پُر مغز، سنجیدہ اور علمی تحریر، جو فکر مند مسلمان کی ضرورت اور مسلمان گھرانے کی زینت ہے۔

تاثرات

حضرت مولانا سید حبیب اللہ شاہ حقانی صاحب زِید مجدہم

مدرس ونگران شعبہ تخصص فی الدعوۃ والارشاد جامعہ دارالعلوم حقانیہ، اکوڑہ خٹک

مؤلف

مفتی عُبید الرحمان صاحب، مردان

رئیس دارالافتاء والارشاد، مردان

مکتبہ دارالتقویٰ، مردان

نام کتاب:۔۔۔۔۔۔نظام زندگی میں دین ومذہب کا حقیقی قدر ومقام
مصنف:۔۔۔۔۔۔۔مفتی عبید الرحمٰن صاحب، مردان
(رئیس دار الافتاء والارشاد، مردان)
تاثرات: حضرت مولانا حبیب اللہ شاہ حقانی صاحب زید مجدہم۔
(مدرس ونگران شعبہ تخصص فی الدعوۃ والارشاد جامعہ دار العلوم حقانیہ، اکوڑہ خٹک)
صفحات: ۔۔۔۔۔۔۔۲۵۱
اشاعت:۔۔۔۔۔۔۔شوال ۱۴۴۵ھ
ناشر:۔۔۔۔۔۔۔۔مکتبہ دار التقویٰ، مردان۔
فون نمبر/وٹس ایپ:
۰۳۰۰۹۳۲۶۱۰۱
۰۳۱۴۳۰۱۷۳۶۴

فہرستِ مضامین

درات

حضرت مولانا حبیب اللہ شاہ حقانی صاحب زید مجدہم[1]

نحمدہ و نصلی علی رسولہ الکریم امابعد!

دین وہ پیغام، ہدایت نامہ اور حکم نامہ ہے جسے اللہ تعالی نے پیغمبروں کے ذریعے انسانوں کی ہدایت، کائنات، خدا اور انسانوں کے مابین صحیح رشتے کی نشان دہی کرنے، خدا، آخرت اور رسالت وغیرہ جیسے بنیادی اور اصولی باتوں کو تسلیم کرنے کے لئے نازل فرمایا ہے اور یہ اللہ تعالی کے سامنے خود کو آخری حد تک جھکا دینے سے عبارت ہے تاکہ آخرت میں رضائے الٰہی حاصل ہو، اور اللہ تعالی اور رسول اللہ ﷺ کی مرضی اور ان کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق اعمال ورسوم کی ادائیگی اور محرمات وممنوعات سے بچنا شریعت ہے۔ یہ دینی تقاضے کے طور پر زندگی کے تمام شعبوں کو محیط ہے انفرادی طور پر بھی اور اجتماعی طور پر بھی۔ کتاب وسنت اور عربی زبان واصطلاحات کی لغات کی روشنی میں دین کا یہ مفہوم اور تصور سامنے آتا ہے۔

اس تعریف میں لازمی عقائد واعمال سب آجاتے ہیں، مذہب بھی اب اس کے معنی میں استعمال ہونے لگا ہے لیکن اصل کے اعتبار سے دین وشریعت کی ترکیب ہی جامع اور مانع ہے، اس میں ایمان وعمل اور متعلقات سب داخل ہیں۔ علامہ سید محمود آلوسی بغدادی "سورۃ شوری کی آیت نمبر ۱۳ کے تحت اقامت دین کے متعلق لکھتے ہیں " دین

---

[1] مدرس ونگران تخصص فی الدعوۃ والارشاد جامعہ دار العلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک

اسلام جو توحید، خدا کی اطاعت اس کی کتابوں، اس کے رسولوں اور یوم جزا پر ایمان کا نام ہے اور وہ سب کچھ ہے جس سے کوئی مومن بنتا ہے" (روح المعانی)

عصر حاضر جو کہ فتنوں کا دور ہے، ہر طرف فتنے ہی فتنے ہیں، عوام الناس بالخصوص نوجوان طبقہ دین و مذہب سے دور ہوتے جارہے ہیں، ملحدین دین، مذہب اور اسلام کے بارے میں قسما قسم شکوک و شبہات پیدا کرنے میں مصروف ہیں، سوشل میڈیا پر مسلمان نوجوانوں کے ذہنوں میں نئے نئے اشکالات پیدا کئے جارہے ہیں اور انہیں علماء و صلحاء سے دور کرنے کی کوششیں کر رہے ہیں، لیکن بحمد اللہ امت کے علماء ان فتنوں سے بے خبر نہیں، وقتاً فوقتاً ان کے شکوک و شبہات کے جوابات دیتے رہتے ہیں۔

انہیں علماء کرام میں ایک نمایاں نام حضرت مولانا مفتی عبید الرحمن صاحبؒ مدظلہ کا ہے، جو کہ ماہر وحاذق طبیب کی طرح زمانے کے نبض پر ہاتھ رکھ کر مرض معلوم کرکے اس کا شرعی قواعد کی رو سے علاج کرواتے ہیں، مفتی صاحب کو اللہ تعالی نے بے پناہ گوناگوں خصوصیات سے نوازا ہے، آپ ایک ممتاز عالم دین ہیں تو صاحب نسبت شیخ طریقت بھی، ایک قابل مفتی ہیں تو منجھے ہوئے مصنف بھی، احقر کی ان سے چند ہی ملاقاتیں ہوئی ہیں لیکن ہر ملاقات میں ان کے علمی رسوخ اور درد دل رکھنے والے مصلح کا یقین کامل ہو گیا۔

زیر نظر تالیف میں بھی ان کا درد دل صاف نظر آرہا ہے، آپ نے دین، اسلام اور مذہب سے متعلق ہر بات مدلل اور مبرہن انداز میں پیش کی ہیں، اس کتاب سے جہاں اہل علم فائدہ اٹھا سکتے ہیں تو وہیں اردو سمجھنے والے حضرات بھی اس سے حظ وافر حاصل کرسکتے ہیں، اللہ تعالی سے دعا ہے کہ اس کتاب کا قارئین نافع بنائیں، ان کے دیگر

تالیفات وتصنیفات سمیت قبول ومقبول فرمائے اور مفتی صاحب اور ان کے والدین ،اساتذہ ومشائخ ومتعلقین کے لئے اخروی نجات کا ذریعہ بنائے۔آمین وصلی اللہ تعالی علی خیر خلقہ محمد وآلہ واصحابہ اجمعین

حبیب اللہ شاہ حقانی

خویدم الطلبہ بجامعہ دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک

۹ذی الحجہ ۱۴۴۳ھ

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

عرض مؤلف: برائے طبع دوم

الحمدُ لله جلّ وعلا، والصّلاة والسّلام على سيّد الأصفياء وخاتم الأنبياء، وعلى آله وأصحابه شموس الفضل وأعلام الهدى. وبعدُ:

اس وقت پوری دنیا میں "الحاد" کا رونا رویا جارہا ہے، ایک عرصہ تک تو خالص مذہبی طبقہ کا اس کی جانب زیادہ رجحان نہیں تھا لیکن اب الحمد للہ اس طبقہ میں بھی اس حوالے سے کسی حد تک سنجیدگی دیکھنے میں آرہی ہے۔

یہاں جو بات عرض کرنے کی ہے وہ یہ ہے کہ جس طرح محسوس امراض میں سے کسی مرض کے علاج کرنے سے پہلے اس کے اسباب معلوم کرنے کی کوشش کی جاتی ہے اور پھر اصل بیماری کے علاج کرنے سے زیادہ زور اس کے اسباب کے تصفیہ پر دیا جاتا ہے، یوں ہی معاشرے کے اطوار، دینی لحاظ سے لوگوں کی ترقی و تنزل وغیرہ امور بھی اسی عالم اسباب کا حصہ ہے، لہٰذا دردمندی اور سنجیدگی کے ساتھ کام کرنے والوں کی ذمہ داری ہے کہ اس حوالہ سے بھی الحاد اور دین بے زاری، جو معاشرے کے لئے مرض سرطان کی حیثیت رکھتے ہیں، کے اصل اسباب اور پھر ان اسباب کے اسباب کی کھوج لگائی جائے، پھر الحاد کی ظاہری اثرات اور نتائج کے مقابلہ کرنے سے بڑھ کر اہتمام کے ساتھ ان اسباب کا مناسب اور پائیدار حل نکالا جائے، امت مسلمہ کی نظریاتی حدود کی حفاظت کرنے کے لئے الحاد کے نام لینے سے زیادہ ضرورت اسی بات کی ہے کہ الحاد کی بلند وبانگ اور خوشنما عمارتیں جن کھوکھلی بنیادوں پر کھڑی ہوتی ہیں، ان بنیادوں کو جڑوں سے اکھاڑنے کی کوشش کی جائے۔

بہر حال الحاد بلا شبہ اس وقت زوروں پر ہے، مختلف طبقات کے لوگ اس کے شکار ہو چکے ہیں، ہماری تکوینی بد قسمتی ہی نہیں ہے بلکہ محنت کی کمی، دردِ دین کی کمیابی اور صحیح ڈھنگ پر دین کی چوکیداری نہ کرنے کا یہ حشر ہے کہ لاکھوں لوگ اس کے دام تزویر میں پھنس چکے ہیں کچھ نے شعوری طور پر اس کو گلے کا ہار بنایا ہے اور بہت سے لوگ لاشعوری طور پر اس کے اسیر بن چکے ہیں۔

خدا تعالیٰ کا شکر ہے کہ کچھ باسعادتِ افراد اس طوفان کا مقابلہ کر رہے ہیں، اللہ تعالیٰ ان کے کاموں میں خوب خوب برکتیں رکھے اور مزید ہمت کے ساتھ کام کرتے رہنے کی توفیق نصیب فرمائیں، تاہم کام کرنے کے نہج مختلف ہوتے ہیں، زیر نظر کتاب بھی معاصر اور مستقبل قریب کے الحاد، ان کے مسموم ومذموم اثرات ونتائج کا ایسا مثبت تصفیہ ہے جس کو اگر سنجیدگی کے ساتھ خشتِ اول بنا کر کام کیا جائے تو خدا تعالیٰ کی ذات سے قوی امید ہے کہ اس طوفان کا چشمہ ہی خشک ہو جائے گا، اس میں کسی کو بہا کر لے جانے کی سکت تو کیا نہ رہے گی کہ خود بہنے کی استطاعت بھی ختم ہو جائے گی، الحادی اور دین بے زاری کی فلک بوس عمارتیں ملیامیٹ ہو کر ماضی کا قصہ ثابت ہوں گی ان شاء اللہ۔

ناکارہ: عبید الرحمن

خادم دار الافتاء والارشاد، مردان

۱۷ شوال ۴۵ھ

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

عرضِ مؤلف

دین ومذہب کے حوالے سے موجودہ معاشرے کا کیا صورت حال ہے؟ موجودہ انسان کی کس حد تک اپنے دین ومذہب کے ساتھ وابستگی ہے؟ انفرادی واجتماعی سطح پر دین اسلام کے کتنے تقاضے کس حد تک زندہ ونافذ ہیں؟ ان باتوں کا جواب اس شخص سے پوشیدہ نہیں ہے جس کو اکابر واسلاف کی سنت "دردِ دین" کا کچھ حصہ ملا ہو اور حوصلہ مند دل ودماغ کا مالک ہو۔ دین کے حوالہ سے پہلے انسان کا کیا رویہ تھا؟ اور موجودہ انسان کا اس حوالہ سے کیا تعامل ہے؟ اس کی کچھ ترجمانی علامہ اقبال مرحوم نے کی ہے، وہ فرماتے ہیں:

وہ بھی دِن تھے کہ یہی مایہ رعنائی تھا — نازشِ موسمِ گُل لالہ صحرائی تھا
جو مسلمان تھا، اللہ کا سودائی تھا — کبھی محبوب تمہارا یہی ہر جائی تھا

اور موجودہ انسان کے رویہ سے متعلق فرماتے ہیں:

ہاتھ بے زور ہیں، الحاد سے دل خوگر ہیں — امتی باعثِ رسوائی پیغمبر ہیں
بُت شکن اٹھ گئے باقی جو رہے بت گر ہے — تھا براہیم پدر اور پسر آزر ہے

جب یہ بات طے شدہ ہے کہ یہ اسباب کی دنیا ہے جہاں صرف نتائج ہی اسباب کے مرہونِ منت نہیں ہوتے بلکہ اسباب کے بھی اسباب دکھائی دیتے ہیں اور خود اسباب بھی عام طور پر دوسرے اسباب ہی کے نتیجے میں پیدا ہوتے ہیں تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ دین ومعاشرے کا یہ افسوس ناک حد تک کمزور تعلق بلاوجہ اور بغیر سبب ہو۔ اور جب پوری دنیا اس قانون پر عمل کر کے ہوشیار وعقل مند کہلاتی ہے کہ نتائج ومسببات کی طرف براہ راست اقدام کرنے سے پہلے اسباب اختیار کرتی ہے اور بیماری وکمزوری کے وقت اصل

اسباب کے علاج کرنے کو ترجیح دیتی ہے، تو ٹھیک یہی رویہ یہاں بھی اپنانا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ دین بے زاری اور بے دینی کے موجودہ سیلاب کے اسباب معلوم کر لئے جائیں اور پھر اپنی حد تک سہی، لیکن ان اسباب کا کوئی قابلِ عمل حل نکالا جائے تا کہ بے دینی اور بد عملی کا یہ سیل رواں یا تو بالکل تھم جائے اور یا اس کی شدت و تیزی میں کسی حد تک کمزوری پیدا ہو جائے۔

موضوع کی غیر معمولی اہمیت

دین و مذہب کے حوالہ سے موجودہ انسانی معاشرہ پستی کے جس گہرے موڑ پر جا کر پہنچا ہے، اس کے مختلف اسباب میں سے ایک بڑا سبب یہ بھی ہے کہ اس کو خود دین و مذہب کا مفہوم و دائرہ کار معلوم نہیں ہے، اس کے مقام و مرتبہ اور غیر معمولی اہمیت کا اس کو اندازہ نہیں ہے، دین و مذہب کے تقاضوں سے وہ پوری طرح واقف ہے اور نہ ہی اس بات کا اس کو پتہ ہے کہ بے دینی اور دین بے زاری کے بھیانک نتائج اور تلخ ثمرات کیا ہو سکتے ہیں؟ اس لئے اگر موجودہ انسان کو ان باتوں سے اچھی طرح واقف کرایا جائے تو بڑی حد تک بے دینی کے موجودہ سیلاب کو لگام دیا جا سکتا ہے اور دین بے زاری کے اس سیلِ رواں میں بہنے والے بہت سے بے چارے انسانوں کو ہلاکت و خسارے کی نذر ہونے سے بچایا جا سکتا ہے۔ اسی جذبے کے تحت یہ چند صفحات تیار ہوئے ہیں۔

دورِ حاضر کے مسلمانوں کا مسئلہ صرف یہی نہیں ہے کہ وہ عملی لحاظ سے شرعی احکام کی پاسداری نہیں کرتے، قدم قدم پر شریعت کے مقرر کردہ حدود و قیود کو پھلانگ کر کے بے دینی کی سلطنت میں داخل ہوتے ہیں بلکہ اس کے ساتھ ساتھ ایک بڑا مسئلہ اور بہت بڑا المیہ یہ بھی ہے کہ ان کو دین و مذہب کی حیثیت اور اس کی قدر و قیمت کا ہی اندازہ

نہیں ہے، دینی تعلیمات وہدایات کے بابت وہ بے اعتمادی کے شکار ہیں، انسانی زندگی میں دین اور اسلام کی کیا اہمیت اور کس قدر مقام ومرتبہ ہے، وہ اس سے ناواقف ہیں، ان کو اس بات کا کماحقہ شعور نہیں ہے کہ دین ومذہب کی تعلیمات کا ان کی زندگی میں کیا کردار ہو سکتا ہے؟ یہ ناواقفیت صرف ایک مسئلہ ہی نہیں ہے جس کو خوش دلی یا بد دلی سے گوش گزار کر برداشت کر لیا جائے یا نوحہ خوانی کر کے فارغ ہو جایا جائے، بلکہ یہ چیز بے دینی اور دین بے زاری کے ایک لمبے چوڑے سلسلے کا بنیادی پتھر ہے جس کی آخری منزل علمی اور پھر ذہنی واعتقادی ارتداد ہے۔

مفکر اسلام حضرت مولانا ابو الحسن علی ندوی صاحب رحمہ اللہ اپنے ایک فکر آمیز مقالہ میں "مقدس ترین جہاد" کے عنوان سے فرماتے ہیں:

"آج کا جہاد، وقت کا فریضہ اور عصر حاضر کی سب سے بڑی دینی ضرورت یہ ہے کہ لادینیت کی اس طوفانی موج کا مقابلہ کیا جائے جو عالم اسلام کے سر سے گزر رہی ہے، نہیں! بلکہ آگے بڑھ کر اس کے قلب ومرکز پر حملہ کیا جائے۔ وقت کا تجدیدی کام یہ ہے کہ امت کے نوجوان اور تعلیم یافتہ طبقے میں اسلام کے احساسات وعقائد، اس کے نظام وحقائق اور رسالت محمدی پر وہ اعتماد واپس لایا جائے، جس کا رشتہ اس طبقے سے چھوٹ چکا ہے۔

آج کی سب سے بڑی عبادت یہ ہے کہ اس فکری اضطراب اور ان نفسیاتی الجھنوں کا علاج بہم پہنچایا جائے، جن کا تعلیم یافتہ نوجوان بری طرح گرفتار ہے اور اس کی عقلیت اور علمی ذہن کو اسلام پر پوری طرح مطمئن کر دیا جائے۔ آج کا سب سے بڑا جہاد یہ ہے کہ جاہلیت کے وہ بنیادی افکار جو دل ودماغ میں گھر کر گئے ہیں، ان سے علم اور عقل کے میدان میں نبرد آزمائی کی جائے یہاں تک اسلام کے اصول ومبادی پھر سے ایمانی جذبات کے ساتھ ان کی جگہ لے لیں۔

کامل ایک صدی گزرتی ہے کہ یورپ ہمارے نوجوان اور ذہین طبقے پر چھاپے مار رہا ہے، شرک والحاد، نفاق وارتیاب کا ایک طوفان ہے جو اس نے ہمارے دل ودماغ میں برپا کر رکھا ہے، غیبی اور ایمانی حقائق پر اعتماد متزلزل ہو رہا ہے اور سیاست اور اقتصاد کے مادہ پرستانہ نظریات اس جگہ پر قابض ہو رہے ہیں، کامل ایک صدی سے اس کشمکش وریخت کا سلسلہ جاری ہے، لیکن کہیں اس کے مقابلے کی کوئی فکر نہیں ہوئی، ہم نے اس کی کوئی پرواہ نہیں کی کہ وقت کے تقاضوں کے مطابق قدیم علمی ترکہ پر اضافے کرنا بھی ہمارا فرض ہے۔ ہمیں اس سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی کہ یورپ کے ان فلسفوں کو سمجھیں اور پھر ان کا علمی محاسبہ کریں بلکہ سرجنوں کی طرح ان کا پوسٹ مارٹم کریں۔

ہمارا سارا وقت سطحی بحثوں کی نذر ہوتا رہا، یہاں تک کہ اس صدی کے آخر میں ہمارے سامنے گویا یکایک یہ منظر آیا کہ ایمان وعقیدہ کی دنیا متزلزل ہے، اور ایک ایسی نسل تیار ہو کر برسر اقتدار آچکی ہے جو نہ اسلام کے عقائد ومبادی پر ایمان رکھتی ہے، نہ اسلامی جذبات اور اسلامی حمیت سے معمور ہے اور نہ اس کا کوئی علاقہ اپنی مومن ومسلم قوم سے اس کے سوا ہے کہ قومیت کے خانے میں اس کا شمار بھی مسلمانوں میں ہوتا ہے یا اگر کچھ تعلق ہے تو محض سیاسی مصالح کی حد تک! بس، اس کے سوا کوئی تعلق نہیں اور اب اس سے بھی آگے بڑھ کر صورت حال یہ ہے کہ یہ لادینی مزاج اور لادینی انداز فکر ادب وثقافت اور صحافت وسیاست کے راستے سے جمہور تک پہنچ چکا ہے اور مسلمان قوموں کے سر پر عمومی پیمانے کی لادینیت کا خطرہ منڈلا رہا ہے۔ خاکم بدہن! وقت کی تیز رفتاری، وہ وقت قریب لا رہی ہے کہ اسلام کو زندگی کے میدان سے کہیں بے دخل کر کے نہ رکھ دیا جائے"۔[1]

---

[1] خطبات علی میاں، ذہنی اور اعتقادی ارتداد: ایک اہم مسئلہ، ج ۳ ص ۷ ۴۳

حالات کے اس موڑ میں جو چیز فوری اور کامل توجہ کی حامل ہے وہ یہ ہے کہ موجودہ مسلمان کے دل ودماغ میں دین اسلام اور اس کی تعلیمات وہدایات کی اہمیت اُجاگر کی جائے، دینی احکام پر اس کی بے اعتمادیوں کی بنیادیں ختم کرنے کی بھرپور کوشش کی جائے، عصر حاضر کے دینی اداروں اور اس سے وابستہ افراد پر یہ ذمہ داری ترجیحی بنیادوں پر عائد ہوتی ہے جس میں ذرا کوتاہی، سستی یا تاخر سے کام لینا مضر ہے۔ یہ دور حاضر کی بہت بڑی ذمہ داری ہے جو امت مرحومہ کے بااستعداد لوگوں پر عائد ہوتی ہے اور یہی چیز اس دور کا بہت بڑا باعث فضیلت کام ہے۔

حضرت مجدد الف ثانی صاحب رحمہ اللہ ایک مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں:

"آج وہ دن ہے کہ تھوڑے سے عمل کو بہت بڑے اجرت اور نہایت قدر کے ساتھ قبول فرماتے ہیں۔ اصحاب کہف سے ہجرت کے سوا اور کوئی عمل ظاہر نہیں ہوا جس نے اس قدر اعتبار فضیلت حاصل کر لی ہے۔ امن وامان اور دشمنوں سے سکون کے وقت کے برخلاف سپاہی اگر دشمن کے غلبہ کے وقت تھوڑی سی بھاگ دوڑ کریں تو بڑی قدر حاصل کر لیتے ہیں۔ یہ قولی جہاد جو آج آپ کو حاصل ہے، جہادِ اکبر ہے، اس کو غنیمت جانیں اور "ہل من مزید" (کیا اور زائد ہے؟) کہیں اور اس قولی جہاد کو جہاد وقتال سے بہتر جانیں۔ ہم جیسے بے دست وپا فقراء اس سے محروم ہیں"[1]

تحریر لکھنے کا پس منظر

ان صفحات کو سیاہ کرنے کی ترتیب یہ بنی کہ پہلے پہل تو اس ناکارہ نے اس درج بالا احساس کو عام کرنے کی کوشش کی، اس پر تین چار صفحات کا مضمون لکھ کر شائع کیا جو ملک

---

[1] مکتوبات، دفتر اول مکتوب ۶۵، ج ۱ ص ۲۰۶۔

کے مؤقر علمی جریدہ "بینات" اور بعض دوسرے رسائل میں شائع ہوا، خیال یہ تھا کہ اس جانب کسی سلیم فکر و نظر حضرات کی توجہ حاصل ہو جائے گی اور ان صفات کے حامل اشخاص اس کام کو اپنے کندھوں پر لے کر انجام دیدیں گے، لیکن جب اس طرف سے کچھ مایوسی پیدا ہو گئی تو خود مطالعہ کرنے لگا اور اس حوالہ سے سو (۱۰۰) سے زیادہ ایسی کتابیں اور مقالات دیکھنے کی توفیق نصیب ہوئی جو اس موضوع سے کسی نہ کسی حد تک متعلق تھے، اس کے بعد لکھنے کی نوبت آئی تو ذہن میں اس موضوع سے متعلق کچھ ایسی باتوں کی آمد شروع ہوئی جن کے بعد پڑھی گئی کتابوں کے مباحث درج کرنے کی زیادہ ضرورت ہی محسوس نہیں ہوئی، البتہ کوشش رہی کہ اس قسم کی ہر بات کو شرعی دلائل وضوابط کے سانچے میں ڈال کر اس کی اچھی طرح تنقیح وتہذیب کی جائے اور اس کے بعد ہی تحریر کی جائے، تاکہ دین کے نام پر پرسودہ اور پراگندہ خیالات کی اشاعت نہ ہو۔

تحریر تیار ہو جانے کے بعد کچھ ساتھیوں کو دکھایا اور پھر رمضان میں "فہم دین کورس" کے عنوان سے ایک کورس ترتیب دیا جس میں اس کتاب کے ابواب اور اس کی اہم باتوں کو دروس ومحاضرات کے قالب میں ڈھالا گیا، یہ کورس گرد وپیش کے مختلف اضلاع کی متعدد جگہوں پر ساتھیوں نے پڑھایا جس کے متعدد امید افزا نتائج سامنے آئے۔ اس کے بعد نظر ثانی کر کے کتاب کی صورت میں اس کو شائع کرنے کا ارادہ کیا۔

کتاب جس موضوع پر ہے وہ نازک بھی ہے عالمگیر بھی اور کسی حد تک مشکل بھی۔ اس کے لئے علم وعمل کا بھی ایک معیار ضروری تھا اور فکر ونظر میں بھی رسوخ وہمہ گیری لازم تھی جبکہ یہ ناکارہ ان صفات سے کئی میل فاصلے پر ہے، اور یوں بھی فکری نوعیت کے موضوعات کی طبعی ساخت ایسی ہوتی ہے کہ وہاں اونٹ ایک کروٹ پر بڑی مشکل سے

جا کر بیٹھتا ہے، اس لئے ضروری نہیں ہے کہ میری تمام باتیں بالکل درست، مفید اور مؤثر ہوں، البتہ اتنا ضرور ہے کہ اس کے ذریعے فکر و نظر کا ایک زاویہ کھل جائے گا جس کو بنیاد بنا کر مزید کام کیا جاسکتا ہے اور اس میں خوب بہتری پیدا کی جاسکتی ہے۔

اپنے کریم رب کے شکر و حمد کے بعد میں ان تمام دوستوں کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں جنہوں نے اس کتاب کی تیاری میں اس ناکارہ کی مدد کی، متعدد ساتھیوں نے کورس کی شکل میں یہ سارے مضامین پڑھائیں، کچھ ساتھیوں نے عربی عبارات کے ترجمے کئے، اللہ تعالیٰ ان سب دوستوں کے تعاون کو قبول فرمائیں اور ان کو بہترین بدلہ نصیب فرمائیں۔ قارئین کرام کی خدمت میں التجاء ہے کہ اگر اس تحریر میں کوئی علمی سقم ہو یا یوں ہی کوئی مفید تجویز ہو، تو برائے کرم اس ناکارہ کو مطلع فرمائیں۔ یہ حقیر خود تو علم و عمل سے بے بہرہ ہے لیکن اہل علم و عمل کی قدر و محبت کرنے کو وسیلہ نجات اور ذریعہ سعادت سمجھتا ہے۔

ناکارہ: عبید الرحمان، مردان۔

۱۴ ذی قعدہ ۱۴۴۳ھ بمطابق ۱۴ جون ۲۰۲۲ء

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

باب اول:

دین، مذہب اور اسلام کا جامع تعارف

دین کا لغوی تعارف

"دین" عربی زبان کا لفظ ہے، اس کے بعد "ب" یا "لام" وغیرہ حروف استعمال ہوتے ہیں جن کی وجہ سے یہ مختلف معنوں کے لئے استعمال ہوتا ہے، البتہ یہ مادہ بنیادی طور پر کسی کی اطاعت کرنے، فرمان برداری کرنے اور تابع و منقاد ہونے کے لئے استعمال ہوتا ہے،

"مقاییس اللغۃ" میں ہے:

> (دین) الدال والياء والنون أصل واحد إليه يرجع فروعه كلها. وهو جنس من الانقياد، والذل. فالدين: الطاعة، يقال دان له يدين دينا، إذا أصحب وانقاد وطاع. وقوم دين، أي مطيعون منقادون.

ترجمہ: "لفظ دین کی اصل ایک ہی ہے جس کی طرف اس کے تمام شاخیں لوٹتے ہیں۔ اور لفظ دین تابعداری اور عاجزی کی جنس یعنی قسم ہے۔ پس دین اطاعت کا نام ہے۔ جب کوئی کسی کا دوست بن جاتا ہے، اس کا تابعدار اور اطاعت گزار بن جاتا ہے تو کہا جاتا ہے دان لہ یدین دینا"۔

اردو کی لغت "القاموس الوحید" میں ہے:

"دان ـ دینا و دیانۃ: جھکنا۔ ذلیل و خوار ہونا۔ فرمان بردار ہونا۔ "لہ" کسی کے سامنے اظہار عجز کرنا۔ فرمان برداری کرنا"[1]

اصطلاحی تعارف

علمی اصطلاح کے طور پر یہ لفظ "علم کلام" مین استعمال ہوتا ہے اور اس علم کے ماہرین کے نزدیک لفظ دین ایک خاص مفہوم رکھتا ہے جس کو وہ اپنی کتابوں میں ذکر کرتے ہیں، علامہ کفوی کی کتاب "کلیات" میں ہے:

وضع الهي سائق لِذَوي الْعُقُول باختيارهم الْمَحْمُود إِلَى الْخَيْر بِالذَّاتِ، قلبيا كَانَ أَو قالبيا، كالاعتقاد وَالْعلم وَالصَّلَاة[2].

ترجمہ: "دین عقل مندوں کے لئے مقرر کردہ ایک الہی قانون ہے جو ان کے پسندیدہ اختیار کے ذریعے ان کو اصل بھلائی کی طرف لے جاتے ہے، چاہے خیر کا تعلق دل کے ساتھ ہو، جیسے عقیدہ اور علم یا جسم کے ساتھ ہو جیسے نماز"۔

علامہ ابن الہام رحمہ اللہ نے اس کی تعریف یہ فرمائی:

الدين وضع إلهي سائق لذوي العقول باختيارهم المحمود إلى الخير بالذات[3].

---

[1] القاموس الوحید، باب الدال، ۵۰۲۔

[2] الکلیات، فصل الدال، ص ۴۴۳۔

[3] کشف الاسرار شرح أصول البزدوي، مقدمة الكتاب، ج ۱ ص ۵۔

ترجمہ: "دین عقل مندوں کے لئے اللہ تعالیٰ کا مقرر کردہ ایک الٰہی قانون ہے جو ان کے پسندیدہ اختیار کے ذریعے ان کو اصل بھلائی کی طرف لے جاتا ہے"۔

"تاج العروس" میں ہے:

الدِّينُ وَضعٌ إلهِيٌّ يَدْعو أَصْحابَ العُقُول إِلَى قَبول مَا هُوَ عَن الرَّسُول.[1]

ترجمہ: "دین اللہ تعالیٰ کا مقرر کردہ ایک قانون ہے جو عقل مندوں کو ان چیزوں کی طرف بلاتا ہے جو چیزیں رسول ﷺ سے ثابت ہیں"۔

ان تعریفات کا حاصل یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے انسان کو عطاء کردہ ضابطہ حیات اور نظامِ زندگی کا نام دین ہے، اور یہی دین کا عرفی مفہوم ہے، اور مسلمانوں کے ہاں جب لفظ دین استعمال ہوتا ہے، تو عموماً یہی مفہوم مراد لیا جاتا ہے۔ اہل مغرب کے ہاں دین کا مفہوم و تصور کیا ہے؟ اور ان کے ہاں دین کس چیز سے عبارت ہے؟ اس کو ذکر کرنا یہاں مقصود نہیں ہے، اس کے لئے شیخ محمد عبد اللہ دراز رحمہ اللہ کی کتاب "الدین" ص ۳۳ تا ۳۷۔ ملاحظہ فرمائیں۔

معنوی لحاظ سے لفظ دین کے قریب قریب ایک اور لفظ بھی استعمال ہوتا ہے، وہ ہے لفظ "ملت"۔ اس کی حقیقت بھی تقریباً وہی ہے، جو دین کا ہے، یعنی "ان احکام و تعلیمات کا مجموعہ جو کسی رسول ﷺ کی وساطت سے اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو بھیجتا ہے"، اور یہی دین کے مفہوم کا بھی حاصل تھا

---

[1] تاج العروس، ج ۳۵، ص ۵۶۔

البتہ دونوں میں ایک اعتباری فرق یہ ہے کہ "خداوندی احکام وہدایات کے مجموعہ "کو دین اس اعتبار سے کہا جاتا ہے کہ انسان اس کی فرمان برداری اور تابعداری کا مکلف ہے، اور خود یہ مجموعہ بھی اسی لائق ہے کہ پورے ہمت وشوق کے ساتھ اس کی پابندی کی جائے ،اور اسی مجموعہ کو ملت اس لحاظ سے قرار دیا جاتا ہے کہ لوگوں کو اس کی طرف جانے اور قبول کرنے کی دعوت دی جاتی ہے۔"کلیات"میں ہے:

الْمِلَّة: اسْم مَا شَرعه الله لِعِبَادِهِ علىٰ لِسَان نبيه ليتوصلوا بِهِ إِلَى آجل ثَوَابه. وَالدّين مثلهَا، لَكِن الْمِلَّة تقال بِاعْتِبَار الدُّعَاء إِلَيْهِ، وَالدّين بِاعْتِبَار الطَّاعَة والانقياد لَهُ.[1]

ترجمہ:"ملت نام ہے اس چیز کا جو اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کے ذریعے بندوں کے لئے مشروع کیا ہے تاکہ اس کے ذریعے لوگ اپنے مقرر کیے ہوئے ثواب کی طرف پہنچ جائیں۔ دین بھی ملت کی طرح ہے، لیکن دعوت دینے کے اعتبار سے اس کو ملت اور اطاعت اور تابعداری کے اعتبار سے اس کو دین کہا جاتا ہے"۔

اسی طرح ایک فرق اہل لغت یہ بھی کرتے ہیں کہ دین عام طور پر اللہ تعالیٰ ہی کی طرف منسوب کرکے استعمال ہوتا ہے، مثال کے طور پر کہا جاتا ہے کہ اللہ کا دین، لیکن ملت کی نسبت پیغمبر ﷺ کی جانب بھی کی جاتی ہے، اسی "کلیات" میں ہے:

الدّين مَنْسُوب إِلَى الله تَعَالَى، وَالْمِلَّة إِلَى الرَّسُول.[2]

---

[1] الکلیات، فصل الذال، ص ۴۴۳.

[2] الکلیات، فصل الذال، ص ۴۴۳.

ترجمہ: "دین کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف اور ملت کی نسبت رسول کی طرف کیا جاتا ہے"۔

اس کے قریب قریب ایک اور لفظ "مذہب" بھی استعمال ہوتا ہے، لغوی لحاظ سے تو یہ لفظ "ذہاب" سے نکلا ہے، اور اسم ظرف یا مصدر کا صیغہ ہے جس کا معنیٰ ہے: چلنے کی جگہ یا چلا جانا۔ اس لحاظ سے تو اس لفظ میں خاصہ عموم ہے، لیکن ہمارے ہاں عام طور پر ایک دین کے ماننے والوں کے درمیان جو مختلف جماعتیں پیدا ہو جاتی ہیں، ان کے لئے یہ لفظ بولا جاتا ہے، چنانچہ دین اسلام کے ماننے والے جو مختلف چار ائمہ فقہاء کی تقلید کرتے ہیں، ان میں سے ہر ایک فقہ مذہب کے نام سے مشہور ہے۔ لفظ "مسلک" بھی لغوی لحاظ سے اس سے کچھ زیادہ مختلف نہیں، تاہم عام طور پر عقائد و نظریات کے اختلاف کے لئے لفظ مسلک اور فروعی اور فقہی اختلافات کے لئے لفظ "مذہب" استعمال کیا جاتا ہے، پہلی نوعیت کا اختلاف گمراہی اور تفرق کا باعث بنتا ہے، جبکہ دوسرے اختلاف میں یہ مضرت نہیں پائی جاتی۔ قاموس میں ہے:

"المذہب: طریقہ، روش۔ اصل۔ عقیدہ ۔ مسلک ۔ ایک دین اور مذہب کے ماننے والوں کے درمیان جو راہ ایک جماعت اپنا لیتی ہے، وہ مسلک کہلاتا ہے، جیسے مسلک اہل سنت والجماعت، مسلکِ اہل بدعت۔ اسلام کے اصحاب مذاہب چار امام ہیں۔۔ ہر ایک طریقہ اخذ و استنباط کا نام مذہب ہے۔ نیز اہل علم کے یہاں مذہب علمی اور فلسفی افکار و نظریات کا وہ مجموعہ ہے جو باہم مربوط ہو کر ایک منظم اکائی کی شکل اختیار کر لے۔"[۱]

---

[۱] القاموس الوحید، باب الذال، ۵۸۵۔

مذہب کا موضوع اور دائرہ کار

"موضوع اور دائرہ کار" سے مراد وہ حدود اربعہ ہیں جن سے کوئی بھی دین
3 یا مذہب بحث کرتا ہے، اور اپنے پیروکاروں کو اس کا پابند بناتا ہے۔ اس لحاظ سے مذہب کا موضوع انسانی زندگی ہی ہے، البتہ انسانی زندگی کے دسیوں پہلوؤں ہیں، اور پھر ہر پہلوؤں میں بے تحاشا تفصیلات ہیں، اب مذہب ان میں سے کس کس پہلو کو کس حد تک موضوع بحث بناتا ہے؟ اور کہاں تک وہ اپنے ماننے والوں کو احکام وہدایات دیتا ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ دنیا میں مذاہب کی مختلف قسمیں ہیں اور پھر ہر قسم کے تحت مختلف افراد داخل ہیں، بنیادی طور پر یہ دو قسم پر ہے چنانچہ کچھ ادیان تو وہ ہیں جو آسمان سے نازل ہونے کا دعوی کرتی ہیں یہ پہلی قسم ہوئی، اور دوسری قسم میں وہ ادیان (نظامہائے زندگی) ہیں جو انسانی عقل وفکر کی ایجاد ہیں۔ پہلی قسم میں سر فہرستِ دین اسلام، یہودیت اور نصرانیت ہے۔ ان تمام ادیان کا مزاج ومذاق اور اہداف ومقاصد یکساں نہیں ہیں، اس لئے موضوع اور دائرہ بحث میں بھی یکسانیت نہیں ہے، اجمالی طور پر اتنی بات جان لینی کافی ہے کہ ہر دین ومذہب انہی دوباتوں (مزاج ومذاق اور اہداف ومقاصد) کے پیش نظر اپنا موضوع بحث کا تعین کرتی ہے، لہٰذا جو دین انسانیت کے محض اخلاقی پہلو کو پیش نظر رکھتا ہے اس کا دائرہ کار بھی اسی حد تک محدود ہوتا ہے اور جس دین کا مقصد انسان کی نفسیاتی پہلو کی اصلاح ودرستگی ہو وہ اسی کے پیش نظر اپنا محدود موضوع متعین کرتا ہے، اسی طرح اگر کوئی دین انسان کے محض انفرادی اعمال واشغال کو اپنا مقصود بناتا ہے تو اس کی تعلیمات وہدایات اسی پہلو کی حد تک منحصر ہوجاتے ہیں، اور معاشرے کے اجتماعی مسائل سے وہ ہاتھ کھینچ لیتا ہے، جس سے اس کے ماننے والوں کو

آزادی حاصل ہو جاتی ہے، اور وہ اس میدان میں جو چاہے، کرسکتے ہیں، ان کا دین ان پر کوئی قدغن عائد نہیں کرتا۔

جہاں تک دین اسلام کے موضوع کا تعلق ہے تو وہ انسانی زندگی کے تمام تر پہلو اور پھر ہر ہر پہلو کے تمام تر تفصیلات واحوال پر مشتمل ہے۔ جلوت وخلوت، ظاہر وباطن اور انفرادی واجتماعی الغرض انسانی زندگی کا کوئی گوشہ ایسا نہیں ہے، جو اسلام کے دائرہ کار سے خارج ہو، اور وہاں اس دین کے کسی پیروکار کو مکمل آزادی حاصل ہو کہ یا تو یہ دین اسلام وہاں انسانیت کی رہنمائی ہی نہ کرے، اوراس کے متعلق کوئی شرعی حکم موجود ہی نہ ہو یا حکم تو موجود ہو لیکن ساتھ یہ اختیار بھی دیا گیا ہو کہ چاہے تو دین کے حکم پر عمل کرے، اور چاہے تو اپنے لئے کہیں اور سراغ تلاش کرے۔ یہی وجہ ہے کہ دین اسلام نے خود بھی یہی دعویٰ کیا کہ وہ بالکل کامل ہے، اور اپنے پیروکاروں کو پورے پورے دین میں داخل ہونے کا پابند بھی بنایا جس کی تفصیل باب دوم میں تفصیل سے ذکر کردی جائے گی ان شاءاللہ۔

دین ومذہب کے اغراض واہداف

کامیابی اور خیر خواہی ایسی چیزیں ہیں جو انسان طبعی طور پر چاہتا ہے، اس کے حاصل کرنے کے لئے تگ ودو کرتا ہے، اور ناکامی اور بد خواہی ایسے ہی اوصاف ہیں جن سے انسان فطری طور پر متنفر ہوتا ہے، وہ نہیں چاہتا کہ یہ چیزیں اس کی مقدر بن جائیں ، بلکہ اس کے قریب ٹپکنے سے بھی وحشت زدہ ہو جاتا ہے، اس لئے دنیا میں کوئی فکر وفلسفہ خواہ وہ کتنا ہی ناکامی اور خسارہ کا شاخسانہ کیوں نہ ہو، لیکن لوگوں کو جب دعوت دینے پر آتا ہے تو کامیابی کے عنوان سے اور خیر خواہی کے اظہار کے ساتھ آتا ہے، اور تبھی لوگ اس

کی دعوت کو خورد اعتناء سمجھنے کی زحمت کرتے ہیں ،ورنہ اگر نعمتِ عقل سے محروم اور انسانیت کی فطرت سے نابلد شخص صریح ناکامی اور بدخواہی کے عنوان سے لوگوں کو اپنی طرف پکارنے لگ جائے، تو ظاہر ہے کہ کسی عقل مند کو اس کی طرف توجہ کرنے کی فرصت نہیں ہو گی سوائے اس کے کہ اس کو مذاق یا نشانہ تنقید بنانا مقصود ہو۔

یہی وجہ ہے کہ ہر دین و مذہب انسانیت کو یہی باور کراتا ہے کہ وہ ان کا خیر خواہ ہے ، اور ان کو کامیابی و کامرانی کے راہ پر گامزن کرانا چاہتا ہے، ناکامی اور نامرادی سے بچا کر فوز و فلاح کے منزل مقصود تک پہنچاتا ہے۔ اب یہ تو ایک الگ سوال ہے کہ جب ہر دین و مذہب کامیابی اور حقانیت کا دعویٰ کرتا ہے تو ان دعووں میں جانچ وپڑتال کیونکر ہو گی ؟اور کس طرح ان دعووں میں سچے یا جھوٹے کی نشاندہی کرنا ممکن ہے ؟لیکن جو بات یہاں ذکر کرنا مقصود ہے وہ یہ ہے کہ:

الف: اہداف و مقاصد سے کسی چیز کی اہمیت اور اس کی قدر و قیمت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

ب: کسی چیز سے اسی قدر توقعات وابستہ کرنا درست ہے جتنے اس کے اہداف و مقاصد ہوں۔

اب رہی یہ بات کہ دین و مذاہب کے اغراض واہداف کیا ہیں ؟تو اس حوالہ سے لوگوں کی آراء مختلف ہیں، جن میں سے نمونے کے طور پر چند خیالات یہاں ذکر کئے جاتے ہیں:

۱: بہت سے لوگوں کے نزدیک کائنات کی مختلف چیزوں کی حقائق خصوصا غیر مادی اعیان (مابعد الطبیعۃ) کی اصل و حقیقت پہچانا دین کا ہدف و مقصود ہے۔

۲: کچھ لوگوں کے ہاں ذہنی سکون واطمینان حاصل کرنا مذہب کا بنیادی ہدف ہے۔

۳: بعض لوگوں کے ہاں انسان کے نفسیاتی خیالات وجذبات کی تسکین کا سامان کرنا اساسی ہدف ہے۔

۴: بعض کے نزدیک آخرت کی ناکامی اور وہاں کے عذاب وذلت سے بچاؤ کی تدبیر کرنا اصل مقصد ہے۔

۵: بسا اوقات قومی شیرازہ کو یکجا رکھنا، معاشرے میں امن وراحت بہم پہنچانا، اور ان جیسی مادی چیزوں کو مذہب کے ساتھ جوڑا جاتا ہے اوراس کو مقصودیت کا درجہ دیا جاتا ہے۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان جیسے جو اغراض واہداف بتائے جاتے ہیں، ان میں سے اکثر تو ایسی باتیں ہوتی ہیں جن کو کسی واقعی آسمانی مذہب کا مقصود قرار نہیں دیا جاسکتا اور بعض چیزیں اس نوعیت کی ہوتی ہیں جو بذات خود تو درست ہیں لیکن محض ان کے حاصل ہونے کو کسی دین ومذہب کا مقصود وہدف ٹھہرانا ایجادِ بندہ ہی معلوم ہوتا ہے، کسی اور دین ومذہب کے متعلق ایسا محدود تصور کیا جائے تو اس میں کوئی زیادہ بعد اس لئے نہیں ہے کہ ان ادیان کو کمال اور ابدیت کا شرف حاصل نہ تھا، لیکن دین اسلام کے متعلق ایسا سمجھنا قطعاً غلط، بے بنیاد ہے، اور بلاشبہ بے قدری اور ناانصافی کی بات ہے۔ خود دین اسلام کا دعویٰ اوراس کا عملی ڈھانچہ اس موقف سے سراسر متصادم ہے۔

اس حوالہ سے خود دین اسلام کا جو موقف ہے، وہ یہ ہے کہ نہ صرف انسانیت کی جزوی کامیابی کو مدنظر رکھتی ہے، اور نہ ہی محض آخرت کی نعمتوں کے حاصل کرنے کو منتہائے مقصود ٹھہراتی ہے بلکہ جس حالت سے بھی انسان کا واسطہ پڑتا ہے، چاہے وہ دنیا کا ماضی، حال اور مستقبل ہو یا آخرت کے مختلف مراحل ہوں، اس میں انسانیت کی مکمل فوز وفلاح

کو بیان کرنا ہی اس کا بنیادی مقصد اور اساسی ہدف ہے، اور اس کے لئے ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ کی پسند ورضامندی کے مطابق زندگی گزاری جائے، اس کی خوشنودی اور قرب حاصل کرنے کی بھرپور کوشش کی جائے، آخرت کی ناکامی اور اللہ تعالیٰ کی ناراضگی سے ہر حال میں بچا جائے۔

یہ بات دین اسلام کے مصادر یعنی قرآن وسنت میں بیسیوں جگہ متنوع اسالیب کے ساتھ بیان کی گئی ہے اور متعدد جگہوں میں اصرار وتکرار کے ساتھ اس کا اعلان واظہار کیا گیا۔ یہاں نمونہ ومثال کے طور پر چند نصوص ذکر کی جاتی ہے۔ "سورۃ نحل" میں ہے:

﴿مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِنْ ذَكَرٍ أَوْ أُنْثَىٰ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهُ حَيَاةً طَيِّبَةً وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ أَجْرَهُمْ بِأَحْسَنِ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ﴾۱

ترجمہ: "جس نے نیک کام کیا مرد ہو یا عورت اور وہ ایمان بھی رکھتا ہے تو ہم اسے ضرور اچھی زندگی بسر کرائیں گے اور ان کا حق انھیں بدلے میں دیں گے انکے اچھے کاموں کے عوض میں جو وہ کرتے تھے"۔

بہت سے ماہرین تفسیر کے نزدیک یہاں "حیاۃ طیبہ" سے دنیا میں خوشگوار زندگی کا ملنا مراد ہے، اور اس کے بعد کے جملے سے آخرت میں بہترین بدلہ دیا جانا مقصود ہے، تو حاصل یہ ہوا کہ جو شخص دین اسلام کی رہنمائی کے مطابق اس کی پیروکاری کرے گا، تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کو دنیا میں بھی خوشگوار زندگی ملے گی، اور آخرت میں بھی اس کو

---

۱ النحل: آیۃ ۹۷.

اپنے عمل کا بہترین بدلہ ملے گا۔ دنیا میں خوشگوار زندگی ملنے کا وعدہ بڑی تاکید کے ساتھ کیا گیا کہ مذکورہ آیت میں عربی زبان کے لحاظ سے "لام" بھی تاکید، اور "نون" بھی تاکید ہے اور "حیاۃ طیبۃ" کے لفظ سے بھی یہ مفہوم مستفاد ہوتا ہے۔

"سورۃ طہ" میں ارشاد خداوندی ہے:

﴿فَإِمَّا يَأْتِيَنَّكُم مِّنِّي هُدًى فَمَنِ اتَّبَعَ هُدَايَ فَلَا يَضِلُّ وَلَا يَشْقَىٰ (۱۲۳) وَمَنْ أَعْرَضَ عَن ذِكْرِي فَإِنَّ لَهُ مَعِيشَةً ضَنكًا وَنَحْشُرُهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ أَعْمَىٰ﴾[1]

ترجمہ: "پھر اگر تمہیں میری طرف سے ہدایت پہنچے پھر جو میری ہدایت پر چلے گا تو گمراہ نہیں ہوگا اور نہ تکلیف اٹھائے گا۔ اور جو میرے ذکر سے منہ پھیرے گا تو اس کی زندگی بھی تنگ ہوگی اور اسے قیامت کے دن اندھا کرکے اٹھائیں گے"۔

اس آیت کے مطابق حضرت آدم علیہ الصلاۃ والسلام کے زمین کی طرف اتارے جانے کے وقت ہی سے ان کو یہ پیغام دیا گیا تھا، اور اس پیغام کا حاصل یہ ہے کہ زمین پر آباد ہو جانے کے بعد اللہ تعالیٰ اپنی طرف سے ہدایت کا سامان بھیجتا رہے گا جو حضرات انبیاء کرام علیہم الصلاۃ والسلام اور ان کے جانشین ونائبین کی شکل میں انسانیت کو ملتا رہے گا، اب جو شخص اس ہدایت کی تابعداری کرتا رہے گا تو وہ نہ گمراہی کا منہ دیکھے گا ، اور نہ ہی دنیا میں کوئی زیادہ مشقت جھیلے گا، اور جو شخص اس سے روگردانی کرے گا تو (دنیا

---

[1] طہ: آیۃ ۱۲۳، ۱۲۴۔

میں بھی) اس کی زندگی تنگ کر دی جائے گی اور آخرت میں تو وہ اٹھایا جائے گا ہی اس حال میں کہ اندھا ہو گا جس کو سیدھے ٹیڑھے راستے کی تمیز نہیں ہوتی۔

یہ تو نمونہ کے طور پر چند نصوص ذکر کئے ہیں ورنہ بیسیوں نصوص میں یہ دعویٰ پوری وضاحت اور صفائی کے ساتھ بیان فرمایا گیا ہے۔ "دین و مذہب کے تعارف" کے ضمن میں متکلمین کی طرف سے دین کی جو تعریف نقل کی گئی ہے، وہ بھی اس بات کی شاہد عدل ہے، چنانچہ وہاں تعریف یہ کی گئی تھی:

وضع الٰهي سائق لِذَوِي الْعُقُول باختيارهم الْمَحْمُود إِلَى الْخَيْرِ بِالذَّاتِ

یہاں تعریف میں جس خیر کی طرف لے جانے کا ذکر کیا گیا ہے وہ عام ہے، آخرت کے ساتھ خاص نہیں ہے، بلکہ دنیا اور آخرت دونوں کی بھلائی و بہتری کو شامل ہے، لہٰذا دین وہ ہے جو عقل مند لوگوں کو دنیا اور آخرت دونوں کی فلاح و کامیابی اور خیر و بھلائی کی طرف لے پہنچائے۔ بعض اہل علم نے تعریف میں اس کا اضافہ بھی فرمایا ہے۔

دنیوی مصالح پر مشتمل ہونے پر اشکال و جواب

اس پر یہ اشکال عائد ہوتا ہے کہ دین اسلام اور اس کے احکام و تعلیمات کا اخروی لحاظ سے مفید ہونا اور آخرت کی مصلحت و فائدہ کے لئے ضامن ہونا تو معقول ہے لیکن دنیوی زندگی میں ان احکام کا کیا فائدہ ہے؟ اور دنیوی مصالح و منافع پر یہ کیونکر مشتمل ہیں؟ مثال کے طور پر دین اسلام نماز، روزہ اور زکوٰۃ و حج وغیرہ عبادات کا انسان کو مکلف بناتا ہے، تو ان احکام کی بجا آوری میں انسان کو (دنیوی زندگی کی حد تک) کیا فائدہ حاصل ہو گا؟ یوں ہی اخلاق و معاشرت وغیرہ ابواب میں جو مختلف پابندیاں ایک مسلمان پر دینی لحاظ سے عائد

ہوتی ہیں، ان کی تعمیل میں انسان کو کیا مادی فائدہ حاصل ہوتا ہے؟ جو شخص سرے سے اسلام ہی کا منکر ہو یا نظریاتی واعتقادی لحاظ سے تو اس پر ایمان واعتقاد رکھتا ہے لیکن عملی لحاظ سے کوتاہی اور بے عملی کا ارتکاب کرتا ہے اور دین اسلام کے ان احکام کو بجانہیں لاتا، اس میں اور اُس مسلمان کی زندگی میں کیا فرق ہے؟ جو ان احکام کو پوری پابندی اور سختی کے ساتھ بروئے کار لاتا ہے۔ ظاہر میں تو دونوں کے درمیان کوئی خاطر خواہ فرق معلوم نہیں ہوتا! کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ عصبیت میں بلا تحقیق یہ دعویٰ کیا گیا ہو!

اس کا جواب یہ ہے کہ یہ دعویٰ بے بنیاد ہے، اور نہ ہی عصبیت پر مبنی ہے، بلکہ ایک صاف سیدھی اور کھلی حقیقت ہے، جس کا کوئی عقل مند منصف مزاج شخص انکار نہیں کرسکتا۔ دینی علوم وفنون میں ایک مستقل فن ہے جس کو "فن اسرار شریعت" سے موسوم کیا جاتا ہے، اس کا موضوع ہی یہی ہے کہ دین اسلام کے مختلف احکام میں کونسے مصالح ومنافع مضمر ہیں؟ دینی احکام کی تعمیل کی صورت میں کیا فوائد حاصل ہوتے ہیں، اور ان سے روگردانی اور اعراض برتنے کی صورت میں کن کن نقصانات کا سامنا کرنا پڑتا ہے؟ اس فن میں دسیوں کتابیں موجود ہیں، سب سے جامع اور موزون کتاب حضرت امام شاہ ولی اللہ صاحب کی مشہور ومفید کتاب "حجۃ اللہ البالغۃ" ہے، اس کتاب کی طرف مراجعت کرنے کے بعد یہ بات پوری طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ اَحکام اسلام میں دنیوی مصالح بھی ملحوظ ہوتے ہیں۔

اسی کتاب میں وہ ایک جگہ بڑی تحقیق وتدقیق کے ساتھ یہ بات ثابت فرماتے ہیں کہ "اللہ تعالیٰ کی عبادت وبندگی کرنا" انسان کی نفسیاتی اور فطری ضرورت ہے لیکن اس کو فلسفیانہ انداز میں سمجھانا عام معاشرے کے ذہنی رسائی سے دور معلوم ہوتا تھا، اس لئے

اس کے لئے آسان تعبیر یہ اختیار فرمائی گئی کہ عبادت اللہ تعالیٰ کا بندے پر حق ہے، اس کے بعد لکھتے ہیں کہ یہ صرف ظاہری عبادات ہی کا مسئلہ نہیں ہے بلکہ شریعت نے جتنے بھی حقوق وآداب مقرر فرمائے ہیں، سب کا یہی حال ہے، چنانچہ فرماتے ہیں:

وعلىٰ هذا ينبغي أن يقاس حق القرآن. وحق الرسول، وحق المولىٰ، وحق الوالدين، وحق الأرحام، فكل ذلك حق نفسه علىٰ نفسه، لتكمل كمالها، ولا تقترف علىٰ نفسها جورا، ولكن نسب الحق إلىٰ من معه هذه المعاملة، ومنه المطالبة، فلا تكن من الواقعين علىٰ الظواهر، بل من المحققين للأمر علىٰ ما هو عليه.[1]

ترجمہ: "قرآن کریم، رسول اللہ ﷺ، آقا، والدین، رشتہ داروں کا حق بھی خدا تعالیٰ کے حق پر قیاس کرلینا چاہیے لہٰذا یہ انسان کے نفس کے حقوق خود اسی کے نفس پر ہے۔ تاکہ نفس اسے ادا کرکے اس کے ذریعے کمال حاصل کرے، اور وہ اپنے اوپر ظلم کا مرتکب نہ بنے لیکن یہ حق اس کی طرف منسوب کیا گیا جس کی طرف سے یہ معاملہ اور جس کی جانب سے مطالبہ ہے۔ پس ان لوگوں میں سے مت ہونا جو ظاہر پر ٹھہر گئے بلکہ ان لوگوں سے بننا جو ہر بات کی اصل تحقیق کرتے ہیں"۔

---

[1] حجة الله البالغة، باب الإيمان بأن العبادة حق الله تعالىٰ علىٰ عباده لأنه منعم عليهم مجاز لهم بالارادة، ج۱ ص ۱۳۲.

اس کے ایک دو صفحہ بعد ذکر کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں پر کوئی بھی حکم اس لئے واجب نہیں کیا کہ اس میں خود اللہ تعالیٰ کا کوئی فائدہ ہے، بلکہ بندوں ہی فائدے کے پیش نظر احکام مقرر فرمائے ہیں، البتہ احکام مقرر کرنے میں افراد کے شخصی فوائد ومنافع کی رعایت نہیں رکھی جاتی بلکہ پوری جماعت کے مفاد و مصلحت کا خیال رکھا جاتا ہے، فرماتے ہیں:

وما أوجب الله تعالى شيئا على عباده لفائدة ترجع إليه تعالى عن ذلك علوا كبيرا، بل لفائدة ترجع إليهم.. وليس المقصود بالذات في العناية التشريعية حال فرد بل حال جماعة كأنها كل الناس، ولله الحجة البالغة.[۱]

ترجمہ: "اللہ تعالیٰ نے اپنے فائدے کے لیے بندوں پر کچھ لازم نہیں کیا ہے بلکہ جن چیزوں کا انہیں مکلف بنایا ہے ان کا فائدہ بندوں کو پہنچتا ہے۔ نیز شرعی احکامات مقرر کرتے وقت صرف ایک مکلف کی حالت کا لحاظ نہیں رکھا جاتا بلکہ تمام جماعت کا لحاظ رکھ کر کوئی حکم مقرر ہوتا ہے"۔

اس باب میں جو غلط فہمیاں پیدا ہوتی ہیں، ان کا ایک بڑا منشا یہ ہے کہ لفظِ "فائدہ" کا مفہوم مستحضر نہیں ہوتا، اس کو صرف ظاہری ومادی فائدہ ہی میں منحصر خیال کیا جاتا ہے، اور وہ بھی صرف حالیہ زمانے میں، پھر جب دیکھتے ہیں کہ نماز پڑھنے اور دیگر عبادات واحکام بجالانے کے باوجود کوئی مادی فائدہ ہاتھ نہیں آیا، تو اس سے نتیجہ برآمد کیا جاتا ہے کہ دین اسلام کی تابعداری کے باوجود دنیا میں کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوتا اور دین دار و بے

---

[۱] حجة الله البالغة، باب تعظيم شعائر الله تعالى، ج ۱ ص ۱۳۳۔

دین دونوں برابر ہیں۔ حالانکہ اگر فائدہ کا صحیح مفہوم مستحضر ہوتا اور اس کو صرف مادی حد تک محدود نہ رکھا جاتا بلکہ نفسیاتی، اخلاقی اور روحانی طور پر جو نئی چیزیں حاصل ہوتی ہیں ،ان کو بھی فائدہ قرار دیا جاتا، اسی طرح مستقبل میں مرتب ہونے والے اچھے نتائج اور بھلے ثمرات کو بھی فائدہ کے مفہوم میں داخل سمجھا جاتا، تو کوئی اشکال پیدا نہ ہوتا۔

دوسرا بڑا باعث، جو در حقیقت اسی سابقہ غلطی ہی کا ایک حصہ ہے، وہ یہ ہے کہ دینی اعمال واحکام کی بجا آوری کے ساتھ مخصوص فوائد کو وابستہ کیا جاتا ہے کہ اگر فلاں فلاں نیک اعمال کئے تو یہ یہ نتائج بر آمد ہوں گے، غرض مخصوص فوائد اور ان کے حاصل ہونے کی مخصوص صورتوں کو دینی احکام کی تعمیل کے ساتھ جوڑا جاتا ہے، حالانکہ قرآن وحدیث میں اس کا وعدہ نہیں کیا ہوا ہوتا۔ اب جب ان اعمال کی تعمیل کی جاتی ہے اور اس کے باوجود وہ مزعومہ فوائد حاصل نہیں ہوتے تو حیرت وتردد کا شکار ہو جاتا ہے۔ حالانکہ صاف ظاہر ہے کہ اس میں دین اسلام کا کوئی قصور ہے نہ ہی قرآن وحدیث پر کوئی حرف آسکتا ہے، اگر غلطی ہے تو اپنے ہی بے بنیاد زعم کی ہے، وہی بے جا تصور ہی اس حیرت وتردد کا باعث بنا ہے۔

ان غلط فہمیوں کا تیسرا بڑا منشا یہ ہوتا ہے کہ "فائدہ" صرف جلب منفعت یا حصول مصلحت ہی کو خیال کیا جاتا ہے، اور مضرت وتکلیف کا دفع ہونا فائدہ خیال نہیں کیا جاتا، حالانکہ جس طرح کسی مصلحت ومنفعت کے حاصل ہونے سے انسان کو نفع ملتا ہے تو یوں ہی دفع مضرت بھی اس کے لئے مفید وسود مند ہوتا ہے، فائدہ ہونے میں یہ دونوں چیزیں برابر ہیں۔ مثال کے طور پر زید کو ہزار روپے ملے لیکن کچھ وقت بعد اس پر کوئی ناگہانی مصیبت آگئی، اور وہ پیسے اسی کے نذر ہو گئے، اور دوسری طرف بکر کو روپیہ پیسہ تو

کچھ نہیں ملا، لیکن متوقع مصیبت سے اس کو عافیت وحفاظت نصیب ہوئی اور اس میں خرچ کرنے کی نوبت ہی نہ آئی تو دونوں فائدہ ہی میں رہے۔ گو شکل وصورت دونوں کی مختلف ہے کہ ایک کے ہاتھ روپیہ آیا اور دوسرا مصیبت سے محفوظ رہا۔

دین ومذہب کی ضرورت واہمیت

"اہمیت" کا لفظ اگرچہ اپنے اصل کے لحاظ سے لفظ "ضرورت" کے برابر نہیں ہے تاہم عام طور پر اردو زبان میں یہ دونوں الفاظ یکساں طور پر استعمال ہوتے ہیں۔ کسی چیز کے ضروری ہونے کا معیار ومدار یہ ہے کہ اس کے حاصل نہ ہونے کی صورت میں انسان کسی شدید حرج ومشقت میں مبتلا ہو جائے، اور اس کی زندگی میں اعتدال برقرار نہ رہے۔ اس معیار کے واضح ہو جانے کے بعد غور کیا جائے تو دین ومذہب انسان کے زندگی کی ایسی ضرورت ہے جس کی ضرورت ہونے میں دو رائے نہیں ہونی چاہیئے۔

اس دعویٰ کی اجمالی دلیل یہی ہے کہ دین ومذہب کی طرف سے جو تعلیمات وہدیات انسان کو مہیا ہوتی ہیں، اگر انسان کو ان سے محروم رکھا جائے تو اس کی متاع زندگانی شدید حرج ومشقت کا شکار ہو جائے گی، اور وہ مسائل ومصائب کی اتاہ گہرائیوں میں گر جائے گا، اگر کوئی چاہے تو عقلی وفکری طور پر بھی اس بات کو سمجھ سکتا ہے اور اگر کسی کی خواہش ہو تو تجرباتی اور عملی مشاہدات اور واقعات کی صورت میں بھی اس کی تصدیق وتائید حاصل کر سکتا ہے۔

پھر دین اسلام چونکہ ایک جامع نظام زندگی اور مکمل ضابطہ حیات ہے، اور اس نے انسانی زندگی کے ہر ہر گوشے کے متعلق انسان کی رہبری کی ہے، اس لئے انسانی زندگی کے ہر ہر شعبہ کے متعلق اسلامی احکام وہدایات کو انسانیت سے چھین کر طاقِ نسیان کی

زینت بنایا جائے تو اس حد تک انسان کی زندگی حرج ومشقت اور عدم توازن کی نذر ہو جائے گی۔ مزید وضاحت اور تفصیل کے لئے ہم اسی بات کو مثال کے طور کے درج ذیل عناوین میں تقسیم کرتے ہیں:

۱: فطری ضرورت۔ ۲: روحانی ضرورت۔ ۳: اخلاقی ضرورت۔ ۴: سکون و اطمینان کی ضرورت۔: معاشرتی ضرورت۔

مذہب ایک فطری ضرورت

دین ومذہب انسان کا ایک ایسا فطری جذبہ ہے جس سے انسان کو جدا کرنا مشکل ہے، انسان ابتدا ہی سے ایسا واقع ہوا ہے کہ وہ کسی مافوق الفطرت ہستی کے وجود کا قائل ومعتقد ہوتا ہے، جب دکھ درد کی موجیں انسان کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہیں تو ایسے موقع پر انسان کسی نادیدہ بلند تر ہستی کے سامنے جھک کر اپنی مرادیں مانگنا چاہتا ہے۔ دنیا میں کوئی معتدبہ قوم ایسی نہیں گزری جو پوری کی پوری قوم اس جذبے سے عاری ہو اور یہی مذہب کی بنیاد ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ ایسی ہستی کی ذات وصفات اور پھر اس کے احکام وہدایات کے متعلق انسانیت نے بڑے ٹھوکر کھائے ہیں، اور اس میں اختلافات کا بھی ایک جہاں ہے لیکن جو بات پوری انسانی معاشرے میں قدرِ مشترک رہی ہے وہ یہ ہے کہ کسی نادیدہ اور بلند تر ہستی کی طرف رجوع کرنا ہے اور اس سے اپنی ضروریات وحاجات مانگنا ہے۔

مولوی عبد الحق صاحب مرحوم (جو بابائے اردو کے نام سے مشہور ہے) نے بالکل درست تحریر فرمایا ہے کہ:

"مذہب انسان کی گھٹی میں بلکہ اس کی فطرت میں ہے۔ جس طرح وہ اپنے آپ سے باہر نہیں نکل سکتا اور اپنی حدود اور قیود کو نہیں توڑ سکتا، اسی طرح وہ مذہب کو جو ابتدائے آفرینش سے اس میں جاگزیں ہے، چھوڑ نہیں سکتا۔ شکوک وشبہات پیدا ہوں گے، نئی نئی تحقیقاتیں ہوتی رہیں گی، جد وجہد قائم رہے گی، اس کے محدود حالات اس میں نئے نئے خیالات پیدا کریں گے، لیکن آخر فتح مذہب کی ہو گی۔"[1]

روحانی ضرورت

اس بات میں کسی ہوش مند کا اختلاف معلوم نہیں ہے کہ انسان دو چیزوں سے مرکب ہے: جسم اور روح۔ ان دونوں چیزیں کے تقاضے بھی مختلف ہیں، اور ان تقاضوں کو پورا کرنے نہ کرنے کے اثرات ونتائج بھی مختلف ومتضاد ہیں۔ جسم کی ضرورت عام طور پر زمین ہی سے پوری ہو جاتی ہے اور اس کے تمام تقاضوں پر لبیک کی جائے تو انسان میں اخلاقی پستی پیدا ہوتی رہتی ہے اور ایک حد پر جا کر اس میں جانوروں کی صفات وخصوصیات جڑ پکڑنا شروع کر دیتی ہیں، اگر معاشرے کے تمام یا اکثر افراد اس کے شکار ہو جائیں تو اس کے بعد متوازن معاشرہ اور فلاحی مملکت کا سوال ہی بے جا ہو جاتا ہے۔

اس کے مقابلہ میں دوسری چیز روح ہے، اس کی ضرورت زمین کی چیزوں سے پوری نہیں کی جاسکتی۔ اس کی ضرورت اگر پوری ہو اور تقاضے بروئے کار لائے جائیں تو انسان میں بلند تر صفات واخلاق جنم لینا شروع ہو جاتے ہیں، خیر خواہی اور خیر سگالی کے جذبات اس سے پھوٹ پڑنا شروع ہو جاتے ہیں، اور دلی اطمینان وسکون کی نعمت نصیب ہو جاتی ہے، اور اگر اس کے تقاضوں کو طاق نسیان میں رکھا جائے تو زندگی میں بے اطمینانی، بے چینی اور تنگ دلی کی نفسیات غالب ہونا شروع ہو جاتی ہیں جس سے انسان کی

---

[1] مقدمہ معرکہ مذہب وسائنس، ص ۳۷۔

انفرادی زندگی اور اجتماعی زندگی مایوسی اور پریشانی کی تصویر بن جاتی ہے۔ روح کی غذا دین ومذہب ہی کا چشمہ صافی ہے اور یہی سے اس کے جائز تقاضوں کی تعمیل وتکمیل کی جاسکتی ہے۔

علامہ ابن القیم رحمہ اللہ نے اس بات کو (حسب عادت) بڑے طول وتفصیل سے بیان فرمایا ہے، وہ اپنی ایک مفید کتاب میں تحریر فرماتے ہیں:

وَهَذِهِ عُقُوبَةُ قَلْبٍ ذَاقَ حَلَاوَةَ الْإِقْبَالِ عَلَى اللهِ وَالْجَمْعِيَّةِ عَلَيْهِ وَالْأُنْسِ بِهِ. ثُمَّ آثَرَ عَلَى ذَلِكَ سِوَاهُ. وَرَضِيَ بِطَرِيقَةِ بَنِي جِنْسِهِ، وَمَا هُمْ عَلَيْهِ. وَمَنْ لَهُ أَدْنَى حَيَاةٍ فِي قَلْبِهِ وَنُورٍ فَإِنَّهُ يَسْتَغِيثُ قَلْبُهُ مِنْ وَحْشَةِ هَذَا التَّفَرُّقِ. كَمَا تَسْتَغِيثُ الْحَامِلُ عِنْدَ وِلَادَتِهَا .فَفِي الْقَلْبِ شَعَثٌ، لَا يَلُمُّهُ إِلَّا الْإِقْبَالُ عَلَى اللهِ. وَفِيهِ وَحْشَةٌ، لَا يُزِيلُهَا إِلَّا الْأُنْسُ بِهِ فِي خَلْوَتِهِ.وَفِيهِ حُزْنٌ لَا يُذْهِبُهُ إِلَّا السُّرُورُ بِمَعْرِفَتِهِ وَصِدْقِ مُعَامَلَتِهِ.وَفِيهِ قَلَقٌ لَا يُسَكِّنُهُ إِلَّا الِاجْتِمَاعُ عَلَيْهِ، وَالْفِرَارُ مِنْهُ إِلَيْهِ..

---

[1] مدارج السالكين بين منازل إياك نعبد وإياك نستعين ج۳ص ۱۵٦)

وَفِيهِ فَاقَةٌ: لَا يَسُدُّهَا إِلَّا مَحَبَّتُهُ، وَالْإِنَابَةُ إِلَيْهِ، وَدَوَامُ ذِكْرِهِ، وَصِدْقُ الْإِخْلَاصِ لَهُ. وَلَوْ أُعْطِيَ الدُّنْيَا وَمَا فِيهَا لَمْ تَسُدَّ تِلْكَ الْفَاقَةَ مِنْهُ أَبَدًا. فَالتَّفَرُّقُ يُوقِعُ وَحْشَةَ الْحِجَابِ. وَأَلَمُهُ أَشَدُّ مِنْ أَلَمِ الْعَذَابِ. قَالَ اللّٰهُ تَعَالَىٰ: {كَلَّا إِنَّهُمْ عَنْ رَبِّهِمْ يَوْمَئِذٍ لَمَحْجُوبُونَ ثُمَّ إِنَّهُمْ لَصَالُو الْجَحِيمِ}. فَاجْتَمَعَ عَلَيْهِمْ عَذَابُ الْحِجَابِ وَعَذَابُ الْجَحِيمِ.

ترجمہ: "جو دل خدا تعالیٰ کی طرف توجہ کا مزہ چکھنے اور اطمنان اور اُنس حاصل کرنے کے بعد بھی کسی اور طرف متوجہ ہوتا ہے، اور اپنی طرح لوگوں کا راستہ اپناتا ہے تو اس کی یہی سزا ہے (کہ اس کے دل کو اطمنان نصیب نہ ہو)۔ جس بندے کو معمولی بھی قلبی نور نصیب ہو، اس کا دل یادِ خداوندی سے غفلت کی صورت میں دردِ زہ میں مبتلاء عورت کی طرح چیخ اٹھے گا۔ دل میں ایک ہیجانی اور پراگندی سی کیفیت ہوگی، جسے خدا تعالیٰ کی یاد اور تنہائی میں خدا تعالیٰ کی طرف توجہ ہی زائل کر سکتی ہے۔ دل پریشان ہوتا ہے اور یہ پریشانی اللہ تعالیٰ کی معرفت کی خوشی اور اس کے ساتھ بندگی کا درست معاملہ ہی ختم کر دیتی ہے۔ دل مضطرب ہوتا ہے اور اس اضطراب کا حل مخلوق سے کنارہ کش ہو کر خدا تعالیٰ کی محبت کو دل میں جگہ دینا ہے۔ دل بھوکا اور محتاج رہتا ہے، یہ بھوک اور افلاس خدا تعالیٰ کی محبت اس کی طرف رجوع اور خدا تعالیٰ کی مسلسل یاد اور سچا اخلاص ہی مٹاتی ہے۔ اگر کسی کو دنیا بھر کی چیزیں بھی دی جائے مگر اس کی یہ ضرورت کبھی بھی پوری نہیں ہوگی۔ اس لیے خدا تعالیٰ کی یاد سے غافل ہو کر کسی اور طرف توجہ کرنے سے دل فراق کے غم میں

مبتلا ہوتا ہے جس کا درد سزا کی درد سے بہت زیادہ تکلیف دہ ہے۔ باری تعالیٰ
کا ارشاد گرامی ہے: ہر گز نہیں بلکہ ان کے (بڑے) کاموں سے ان کے دلوں
پر زنگ لگ گیا ہے۔ ہر گز نہیں بیشک وہ اپنے رب سے اس دن روک دیئے 4
جائیں گے۔ چنانچہ ان لوگوں کو جہنم اور خدا تعالیٰ کے زیارت سے محرومی کی
سزا دی جائے گی"۔

اخلاقی ضرورت

نفسیات کے ماہرین اس بات پر متفق ہیں کہ انسان جو کچھ کام کرتا ہے اس میں اس کے قصد وارادے کا دخل ہوتا ہے، اسی قصد وارادے کی ابتدائی بیج کو جذبہ کہا جاتا ہے، انہی جذبات میں جب ایک حد تک قوت واستحکام پیدا ہو جاتی ہے تو اس کو اخلاق سے تعبیر کیا جاتا ہے ۔ اخلاق اگر اعتدال پر ہو تو اچھے اخلاق کہلاتے ہیں، اور اگر اس میں پستی وانحطاط ہو تو برے اخلاق سے موسوم کئے جاتے ہیں۔ درست اور مثالی فلاحی معاشرے کا بنیادی پتھر یہی اچھے اخلاق ہیں، کوئی شخص خواہ کتنا ہی دولت مند اور عقل مند کیوں نہ ہو، لیکن جب تک اس کے اخلاق درست نہ ہو تو معاشرے میں کوئی باعزت مقام پا سکتا ہے اور نہ ہی ایسے انسانوں کے ملنے سے کوئی متوازن معاشرہ تشکیل پا سکتا ہے۔ اس لئے اخلاق ایک بنیادی معاشرتی ضرورت ہے اور دین ومذہب ہی وہ گھاٹ ہے جس سے اس ضرورت کی اچھی طرح تکمیل کی جا سکتی ہے، بلاشبہ واقعی اخلاق ساز قوت دین ومذہب ہی ہے۔ امام شاہ ولی اللہ صاحب رحمہ اللہ بڑے پتے کی بات ذکر کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

أصل أصول البر، وعمدة أنواعه هو التوحيد، وذلك لأنه يتوقف عليه الإخبات لرب العالمين، الذي هو أعظم الأخلاق الكاسبة للسعادة

وهو أصل التدبير العلمي الذي هو أفيد التدبيرين، وبه يحصل للإنسان التوجه التام تلقاء الغيب، ويستعد نفسه للحوق به بالوجه المقدس، وقد نبه النبي صلى الله عليه وسلم على عظم أمره، وكونه من أنواع البر بمنزلة القلب إذا صلح صلح الجميع، وإذا فسد فسد الجميع[۱]

ترجمہ: "توحید سب نیکیوں کی اصل اور سب سے عمدہ ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کے لیے عاجزی اور انکساری اس پر موقوف ہے اور یہ عاجزی سعادت کے اسباب میں سے ایک بڑی چیز ہے۔ یہ اس علمی تدبیر کی بنیاد ہے جو دونوں تدبیروں (علمی اور عملی) میں زیادہ مفید ہے، اس کی وجہ سے بندہ کو غیب کی طرف کامل توجہ ہوتی ہے اور اس کی وجہ سے نفس انسانی وجہ مقدس (پاک مخلوق) میں شامل ہونے کے قابل ہوتا ہے۔ نبی کریم ﷺ نے اس کی عظمت پر تنبیہ کی ہے اور اس کو تمام نیکیوں میں دل کی طرح قرار دیا ہے کہ جب یہ درست ہو جائے تو سب اعمال درست ہوں گے"۔

اس کی مختصر سی وضاحت یہ ہے کہ اچھے اخلاق اور نیک عادات ایسی چیزیں ہیں جو عموماً حاصل کرنے سے ہی آتی ہیں، پھر اس کے حاصل کرنے کا جو طریقہ کار ہے، اس میں بنیادی طور پر دو چیزوں کی ضرورت ہے جن میں سے ایک کا تعلق نظریہ و تصور ہے اور دوسرے کا عمل و کردار سے، پہلے کو علمی تدبیر جبکہ دوسرے کو عملی تدبیر کہا جاتا ہے۔ اس میں بھی "علمی تدبیر" ہی بنیادی چیز ہے، عملی تدبیر اسی کو منطبق کرنے اور پکا کرنے کے

---

[۱] حجة الله البالغة ،باب التوحيد،ج۱ ص ۱۱۵)

لئے اختیار کی جاتی ہے اور یہ علمی تدبیر، جو کہ اچھے اخلاق کے لئے بیج و تخم کی حیثیت رکھتی ہے، یہی ہے کہ انسان کو اپنی حیثیت اور اپنا واقعی مقام معلوم ہو کہ کرہ ارض میں اس کی حیثیت "سب کچھ" کی نہیں ہے بلکہ ایک بندے کی ہے، اسلام کا تصور توحید اسی کا درس دیتا ہے اور ہم پوری ذمہ داری کے ساتھ کہتے ہیں کہ پائیدار طور پر یہ تصور عقیدہ توحید ہی کے نتیجے میں حاصل ہوتا ہے۔ اگر دین اور اسلام کو درمیان سے نکال لیا جائے تو اخلاق کی بنیادی خشت ہی منہدم ہو جائے گی، اس کے بعد کوئی تعمیر کرنا چاہے تو کس چیز پر اس کی عمارت استوار ہو!۔

ایک اشکال اور اس کا جواب

ہمیں اس سے انکار نہیں ہے کہ بعض لوگ فطری لحاظ سے اچھے اخلاق کے حامل ہوتے ہیں، وہ مذہب کے توسط کے بغیر ہی اچھے اخلاق والے ہوتے ہیں، لیکن اس سے یہ نتیجہ کشید کرنا بالکل غلط ہے کہ ایسی صورت میں مذہب کی ضرورت باقی نہیں رہتی، کیونکہ:

الف: دین و مذہب کا فائدہ صرف اخلاقیات میں منحصر نہیں ہے بلکہ انسان اپنی دیگر ضروریات کی تکمیل میں بھی اسی مذہب کا محتاج ہے اور کچھ بھی نہ ہو تو کم از کم آخرت کی صلاح و فلاح تو محض دین و مذہب کی رہین منت ہے، اس لئے کسی عقل مند کے لئے مذہب سے استغناء اختیار کرنا ممکن نہیں ہے۔

ب: ایسے بااخلاق لوگوں کی تعداد معاشرے میں کتنی ہے؟ عام معاشرے میں ایسے خوش نصیب بااخلاق لوگوں کا تناسب کتنا ہے؟ ظاہر ہے کہ بہت ہی کم ہے اور اکثریت ایسے ہی لوگوں کی ہوتی ہیں جو پیدائشی طور پر اچھے اخلاق کے عادی نہیں ہوتے، خصوصا مادیت کے علمبردار اس دور میں تو ایسے لوگ ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملتے۔ لہٰذا کم تناسب

رکھنے والے افراد کی ذاتی اور انفرادی صلاح ودرستگی سے کسی واقعی فلاحی معاشرے کے قیام کا خواب شرمندہ تعبیر نہیں ہو سکتا۔

اسی طرح ہم یہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ بسا اوقات انسان مذہب کے بغیر محض کسی مادی غرض کے لئے بھی اچھے اخلاق کا مظاہرہ کرتا ہے اور کوشش کرتا ہے کہ لوگ اس کے شر وتکلیف سے محفوظ رہے۔ لیکن ان جیسے مصنوعی اور وقتی اچھے مظاہروں کو اچھے اخلاق کا نام دیا جاسکتا ہے اور نہ ہی اس کمزور شاخ پر مثالی معاشرے کے آشیانے کی بنیاد رکھی جاسکتی ہے، اگر رکھی جائے گی تو بلاشبہ ناپائیدار ہی ہوگی اور اگر ذرہ بھی مادی غرض دوسری صورت میں متشکل ہو جائے تو فوراً پینترا بدل جائے گا اور اچھے مظاہروں کی بجائے متضاد مظاہرے کا لاوا پھوٹنا شروع ہو جائے گا۔

حکیم محمد اقبال مرحوم نے کتنا ہی پیارا مصرعہ کہا ہے:

تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی

جو شاخ نازک پہ آشیانہ بنے گا، ناپائیدار ہو گا

اور پھر اگر یہی رویہ افراد سے تجاوز کر کے جب قوموں اور ملکوں کے درمیان پیدا ہو جائے تو اس سے خونی جنگوں کا تانتا باندھنا شروع ہو جاتا ہے جس کے نتیجہ میں "انسانیت" اور "امن وامان" کی باتیں سراب خیال بن کر رہ جاتی ہیں۔ شیخ محمد قطب بجا طور پر لکھتے ہیں:

"بلاشبہ مادہ پرست انسان کو کچھ مادی فائدے بھی حاصل ہوئے ہیں مگر مادہ پرستی ایک ایسی لعنت ہے کہ جس کی وجہ سے یہ ظاہری چند حاصل شدہ فائدے بھی ضائع ہو جاتے ہیں، انسان ان کی محبت میں اندھا ہو کر اپنے ہی ابنائے نوع سے مستقل طور پر بر

سر پیکار رہتا ہے۔ حرص وہوس، خواہشات نفس و نفرت کے تیز و تند جذبات پر اسے کوئی قابو نہیں رہتا، اور وہ کبھی ان کے غلبے سے آزاد نہیں ہو سکتا۔ جو قومیں مادہ پرستی کی روشنی میں چل کر نکلتی ہیں ان پر ایک مستقل آویزش اور خانہ جنگی کی حالت طاری رہتی ہے، جس کے نتیجے میں زندگی کا تمام نظام درہم برہم ہو جاتا ہے، اور سائنس اور اس کے ہیبت ناک ہتھیار نسل آدم کی خدمت کے بجائے اس کی تباہی و بربادی میں صرف ہونے لگتے ہیں۔

روشنی کے مینار: مذہب انسان کو اپنے لئے جینے کے بجائے دوسرں کے لئے جینا سکھاتا ہے، اسے ایک اعلی اور پاکیزہ نصب العین دیتا ہے، اور اس نصب العین کے لئے مصائب و آلام کا خندہ پیشانی سے استقبال کرنا سکھاتا ہے، اگر انسان مذہب کے بخشے ہوئے اس ایمان و یقین سے محروم ہو جائے تو پھر اس کو اپنی ذات کے علاوہ کوئی نظر نہیں آتا۔ اس کی ساری زندگی خود غرضی اور خود پرستی کا مرقع بن جاتی ہے، اور اس میں اور وحشی درندوں میں کوئی فرق باقی نہیں رہتا۔"[1]

سکون واطمینان کی ضرورت

دیکھنے میں تو انسان بہت سے کام کرتا ہے، وہ ہر گھڑی کچھ نہ کچھ کرتا ہے، کہیں تو وہ کھاتا پیتا ہے، کہیں چلتا پھرتا ہے، الغرض وہ ہر آن کسی کام میں لگا رہتا ہے، لیکن ان سب یا اکثر کاموں کی تہہ در تہہ گہرائی میں جاکر دیکھا جائے، تو واضح ہوتا ہے کہ وہ سکون واطمینان کی خاطر یہ کام کرتا ہے، قلبی راحت و چین کی تحصیل کے لئے وہ ایسے بہت سے کام کر گزرتا ہے تاکہ آرام و سکھ اس کو میسر آجائے۔ یہ انسانی نفسیات ہے کہ اگر دلی

---

[1] اسلام اور جدید ذہن کے شبہات، ۱۹۔

سکون اور قلبی راحت کے بغیر خزانہ قارون اور عمر نوح بھی اس کے قدموں پر نچھاور کیاجائے تو بھی وہ مطمئن نہیں ہو گا اور اپنی حد تک اسی متاع گمشدہ کی تلاش و جستجو کرتا رہے گا۔انسانی حقوق کے نام سے جو ادارے کام کر رہے ہیں ،وہ اگرچہ مذہب کی بیخ کنی کا ایک نامبارک وناتمام کوشش ہے لیکن وہ بھی کام اسی پروپیگنڈہ پر کرتے ہیں کہ انسان کو تمام جکڑ بندیوں اور بندشوں سے نکال کر سکون وراحت کی زندگی گزارنے کا موقع مل سکے۔

دینی تعلیمات کے باعث سکون ہونے کے بنیادی وجوہات

دلی بے سکونی اور بے اطمینانی کے اصل سبب کا تعین اور پھر اس کے حصول کا سامان دین ومذہب کے ہاتھ میں ہے۔اطمینان کا پورا سامان دین ومذہب ہی کے ہاتھ میں ہے،چنانچہ دین ہی اللہ تعالیٰ کی ہستی اور اس کی صفات کا سبق دیتا ہے، قیامت کے قائم ہونے اوراس دن کے تمام ترجزئیات کی تعلیم دیتاہے اور یہی وہ چیزیں ہیں جن سے دلی سکون کے چشمے نکلتے ہیں اور دکھی انسانیت کوراحت واطمینان کی دولت نصیب ہوسکتی ہے۔

پہلی دلیل/وجہ:

اس بات کی ایک دلیل توخود مذہب کا سچادعویٰ ہے،چنانچہ قرآن کریم میں ہے:

﴿أَلَا بِذِكْرِ اللهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوبُ ﴾

ترجمہ:"خبردار!اللہ کی یاد ہی سے دل تسکین پاتے ہیں"۔

دوسری دلیل/وجہ:

دوسری بڑی دلیل استقراء ہے،چنانچہ صدیوں سے اس بات کا تجربہ کیاگیااور ہر صدی میں اس بات کو بار بار آزماکر دیکھاگیاکہ جن کو صحیح معنی میں اللہ تعالیٰ کے یاد

کرنے کی دولت نصیب ہوتی ہے، وہ دلی راحت وآرام کی زندگی گزارتے ہیں، ظاہری طور پر معیشت ومعاش کے اسباب وذرائع کم ہونے کے باوجود قلبی اطمینان کی لذت سے وہ آشنا ہوتے ہیں، اور جن کو اس کی توفیق نہیں ملتی وہ ظاہری اسباب تعیش کی فراوانی کے باوجود دلی چین کی نعمت سے نا آشنا ہوتے ہیں، اس بیش بہا دولت کے حاصل کرنے کے لئے وہ مختلف قسم کے مصنوعی طریقے اختیار کرتے ہیں جن سے وقتی طور پر تو مقصود بر آتا ہے لیکن ایک تو یہ دائمی نہیں ہوتا جبکہ ضرورت دائمی سکون کی ہوتی ہے اور ساتھ دوسرا نقصان یہ ہوتا ہے کہ یہ غیر فطری اور مصنوعی اسباب اپنا کچھ نہ کچھ منفی اثرات بھی چھوڑ کر جاتے ہیں۔ دور جانے کی ضرورت نہیں ہے آج بھی دینی مشرقی اور لادینی مغربی معاشروں کے اندرونی حالات کا مقارنہ کر کے اس بات کا تصفیہ کیا جاسکتا ہے۔

تیسری دلیل/وجہ:

تیسری دلیل نفسیاتی اور عقلی نوعیت کی ہے، وہ یہ ہے کہ دین ومذہب سے وسعت ظرفی اور بلند خیالی پیدا ہوتی ہے، اور دینی تعلیمات سے بہرہ ور فرد کے نزدیک نفع ونقصان اور بھلائی برائی صرف دنیوی مادی کسوٹی پر نہیں پرکھی جاتی اور صرف مادی بنیادوں پر ہی اس کا فیصلہ نہیں ہوپاتا بلکہ اس میں بڑا اور نمایاں حصہ تصورِ آخرت اور انجام اخروی کا بھی ہوتا ہے۔ اس لئے وہ دل کی آنکھ سے دیکھتا ہے کہ جو چیز یہاں نقصان وخسارہ کی صورت میں دکھائی دے رہا ہے اس میں ضرور خسارہ ہی ہوگا اور اس میں خیر وبھلائی کا کوئی امکان نہیں ہوگا اور اگر ایسا ہوا بھی تو ایسی نادیدہ ہستی کے وجود پر اس کا غیر متزلزل یقین ہوتا ہے جو ہر چیز پر بے حد وحساب قدرت رکھتا ہے، اور اس کی مشیت وارادے کے بغیر اس کائنات میں کبھی کچھ نہیں ہوسکتا اور جو اس درجہ قدرت رکھنے کے باوجود مسلمان پر حد

درجہ شفیق اور رحیم بھی ہے، لہٰذا لامحالہ یہ تکلیف و مشقت یا متوقع مضرت واذیت کسی خیر وبھلائی کا مقدمہ یا پیش خیمہ ہوگا۔

انہی جیسی باتوں سے اس کے دل کو تسکین کا سامان فراہم ہوتا ہے۔ حضرت شیخ عبد القادر جیلانی رحمہ اللہ اپنی مفید اور وقیع کتاب "الفتح الربانی" میں بجا طور پر فرماتے ہیں کہ:

"فقر اور صبر اہل ایمان کے سوا کسی میں جمع نہیں ہوسکتے"۔[1]

اور یہ صرف فقر ہی کی بات نہیں ہے بلکہ طبیعت و مزاج اور مفاد کے خلاف کسی بھی صورت حال سے دین وایمان ہی کی بدولت سے نمٹا جاسکتا ہے۔ اب اگر کوئی شخص دین ومذہب کا سرے سے قائل ہی نہیں ہے تو وہ کیونکر ان باتوں کا یقین کرسکتا ہے!

مشہور اسلامی مفکر حضرت شیخ محمد قطب تحریر فرماتے ہیں:

"مادہ پرستی انسان کی تنگ نظری کا شاخسانہ ہے اس کی خرابیوں سے بچنے کے لئے انسانیت کے ذہنی افق کو وسیع کرنے کی ضرورت ہے، یہ مقصد صرف مذہب ہی کے ذریعہ سے حاصل کیا جاسکتا ہے، صرف وہی انسانیت کو نئی وسعتوں اور نئی بلندیوں سے ہمکنار کرسکتا ہے۔ کیونکہ مذہب کی نگاہ میں زندگی صرف اسی دنیا تک محدود نہیں بلکہ اس کے بعد بھی اس کا سلسلہ تاابد جاری وقائم رہتا ہے، یہ عقیدہ انسان کے دل میں امید کے نئے چراغ روشن کرتا ہے، اسے بدی ،جبر واستبداد اور ظلم کے خلاف پامردی سے نبرد آزمائی کا حوصلہ دیتا ہے اور اسے بتاتا ہے کہ سارے انسان اس کے بھائی ہیں، محبت، باہمی ہمدردی اور عالمگیر اخوت کی یہ تعلیم ہی انسانیت کو امن وسکون اور حقیقی خوشحالی اور ترقی سے مالامال کرسکتی ہے، ان حقائق کے ہوتے ہوئے کون

---

[1] الفتح الربانی، المجلس الثانی، ص ۶۷

کہہ سکتا ہے کہ مذہب انسان کی ناگزیر ضرورت نہیں ہے یا انسان آج بھی اسی طرح اس کا محتاج نہیں ہے جیسا کہ صدیوں پہلے تھا کارزارِ حیات کے لئے مذہب جس طرح انسان کو تیار کرتا ہے اس طرح کوئی اور طاقت انسان کو تیار نہیں کر سکتی۔"[1]

سید ابو الاعلیٰ مودودی صاحب نے بالکل درست تحریر فرمایا ہے کہ:

"تجربہ نے بتایا ہے کہ اگر خالص مادی فائدہ پیش نظر ہو، اور کوئی اعلیٰ اخلاقی اور روحانی نظام موجود نہ ہو تو محض مادی فائدہ بھی انسان کو حاصل نہیں ہوتا ہے، ارنلڈ ٹائن بی سیکولرزم کے نتائج کا جائزہ لے کر کھلے الفاظ میں اس کی ناکامی کا اعتراف کرتا ہے:

"یہ اب واضح ہو گیا ہے کہ اگر صرف دنیاوی خوشی کو مقصد زیست بنا دیا جائے گا تو اس میں فرد کی مادی خوشحالی اور دنیاوی سکون کا حصول بھی ناممکن ہے۔ ہاں یہ قابل فہم ہے کہ اگر سیکولرزم سے بلند و بالا کوئی روحانی مقصد سامنے رکھا جائے تو ایک ضمنی نتیجہ کی حیثیت سے انسان کو دنیاوی خوشی بھی حاصل ہو جائے۔"[2]

تمدنی اور معاشرتی ضرورت

کہا جاتا ہے کہ انسان مدنی الطبع ہے یعنی وہ طبعی لحاظ سے معاشرتی زندگی کا محتاج یا کم از کم دلدادہ ہے، الگ تھلگ رہ کر اور سب کچھ سے ہٹ کٹ کر زندگی بسر کرنا اس کی طبیعت کے خلاف ہے، اس لئے یہ ایک حد تک اس کی ضرورت بھی ہے اور چاہت بھی کہ اپنے دوسرے بنی نوع کے ساتھ مل کر رہے، اسی کو معاشرت کہتے ہیں۔ معاشرت کا پہیہ صحیح سمت پر تب محوِ سفر ہو سکتا ہے جبکہ معاشرے کا مقصدِ حیات ایک ہو، اور وہ مقصد ہو

---

[1] اسلام اور جدید ذہن کے شبہات، ص ۲۰۔

[2] اسلامی ریاست، ص ۲۷۔

بھی ایسی نوعیت کا جس میں باہمی رقابت وتصادم کی نوبت پیش نہ آتی ہو، جبکہ ایسا دین ومذہب اور تصورِ آخرت ہی کے ذریعے ممکن ہے۔

اسی طرح ارسطور کے بقول انسان ایک سیاسی حیوان ہے، اور مادیت کا بھاگ دوڑ اس کو خود غرضی کی انتہاء تک لے جاتا ہے، اس کے بعد اگر وہ طاقتور یا چالاک وچالباز ہو تو موقع ملنے پر وہ ضرور دوسروں کے حقوق واملاک چھین لے گا جبکہ اس کی وجہ سے معاشرہ جنگل کی تصویر بن جاتی ہے جہاں "جس کی لاٹھی اس کی بھینس" کا دور چلتا ہے، ایسے معاشرے کا جو کچھ اثر انسان کی طبیعت پر پڑے گا، اس کا اندازہ لگانا کوئی مشکل نہیں ہے۔ کسی دانا شاعر نے کیا ہی خوب کہا ہے:

والظلمُ من شیم النفوس فإنْ تجدْ ... ذا عفّةٍ فلعلّةٍ لا یظلم

انسانی معاشرے کو اس روش سے پاک وصاف کرنے میں اگر کوئی چیز ہر حال میں کار گر ثابت ہو سکتی ہے تو وہ دین ومذہب ہی ہے جو انسان کو بندہ بنا کر اللہ تعالیٰ کے ساتھ جوڑ دیتا ہے، اور اللہ تعالیٰ کو ہر چیز کا عالم، خبیر اور ہر چیز پر قادر یقین کرتا ہے جس کے علم وقدرت سے کوئی چیز خارج نہیں ہے۔

کیا حکومت اور انتظامی ڈھانچہ کافی نہیں؟

اگر کہا جائے کہ حکومتی نظام، فوج وپولیس کا انتظامی ڈھانچہ اور دستور وقانون کا عملی اجراء وتنفیذ بھی اس مقصد کی تکمیل کے راستے ہیں لہٰذا تو پھر صرف مذہب کی اہمیت پر اصرار کرنے کا کیا جواز رہ جاتا ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ چیزیں ظلم واذیت کے تمام پہلوؤں اور ان کی ساری صورتوں کا احاطہ کرنے سے قاصر ہیں۔ ایک آسان سیدھی مثال یہ ہے کہ انسان کو اس بات سے تکلیف واذیت ہوتی ہے کہ کوئی شخص اس کے پیٹ پیچھے

کوئی ایسی بات کہے جو اس کو ناگوار ہو، اسی طرح انسان کے لئے یہ بات بھی باعث اذیت بن جاتی ہے کہ کوئی شخص ماتھا چڑھا کر نفرت وبغض کے انداز میں اس سے ملے یا دل ہی دل میں اس سے حسد وبغض کا رشتہ برقرار رکھے، اس لئے مذہب تو ان چیزوں کا سدباب کرتی ہے اور اس کو ممنوع ومذموم ٹھہرا کر روکتی ہے لیکن حکومتی انتظامی ڈھانچے یا دستور وقانون کے سہارے سے کیا اس کی روک تھام ممکن ہے!

مولوی عبدالحق صاحب تحریر فرماتے ہیں:

"انسان اور دیگر تمام حیوانات میں ایک خاص فرق ہے، اور وہ یہ کہ انسان میں خصوصیتیں جمع ہیں جو کسی دوسرے حیوان میں نہیں، اور اس لئے اس کا ارتقا دوسرے حیوانات کے ارتقا سے مختلف ہے۔ ایک تو عقل ہے۔۔ دوسری خصوصیت انسان میں مدنیت کی ہے یعنی وہ قابلیت کے اثر سے وہ اپنے بنی نوع سے مل جل کر جماعتوں میں رہ کر کام کرتا ہے۔ یہ دو خصوصیتیں ایک دوسرے کی مخالف ہیں اور آپس میں ان کی مصالحت ممکن نہیں معلوم ہوتی۔ عقل کا کام تفرد، انفعال اور فنا ہے۔ تمدن کی ترقی کے لئے ایثار اور سوسائٹی کے فائدے کو اپنے فوائد پر مقدم سمجھنا اپنے اغراض وفوائد کو دوسروں کے لئے اور خصوصاً ان نسلوں کے لئے جو اب تک وجود میں نہیں آئیں قربانی کرنا ہے، یہ ایثار وقربانی سائنس اور عقل نہیں سکھا سکتی، اس کی ہدایت عقل اور سائنس سے بالا ہے اور یہ ہدایت مذہب پر مبنی ہے، ارتقا کا مقصد جدوجہد اور قربانی سے حاصل ہوتا ہے اور یہ صرف مذہب میں پایا جاتا ہے جس کی ہدایت عقل سے بالا ہے، عقل اس کی مخالف ہے ورنہ اگر وہ غالب آجائے گی تو شیرازہ نظام تمدن بکھر جائے گا۔ ارتقائے عالم میں افراد سوسائٹی کے لئے قربانی کر دیئے جاتے ہیں۔"

اس کے بعد بڑے پتے کی بات تحریر فرماتے ہیں:

"عقل افراد کو اپنے فائدے کے لئے سعی کرنا سکھاتی ہے اور انسانی ترقی کی راہ میں حائل ہوتی ہے، مذہب ہمیں ذاتی اور شخصی قربانی اور ایثار سکھاتا ہے نہ صرف ان لوگوں کی خاطر جو ہمارے آس پاس زندہ موجود ہیں بلکہ ان لوگوں کے لئے بھی جو آئندہ زمانے میں آئیں گے، اور ابھی وجود میں بھی نہیں آئے حالانکہ یہ امر ذاتی فوائد کے خلاف ہے، غرض انسانی تمدن میں دو مخالف رجحانات کی نشو نما ہوتی ہے، ایک تو وہ جس میں افراد کو سوسائٹی کے تابع ہونا پڑتا ہے، اور دوسرا رجحان عقل ہے جسے اس اتباع میں جس میں اس کا مطلق فائدہ نہیں بلکہ زیادہ تر ایسے لوگوں کا فائدہ ہے جو ابھی وجود میں نہیں آئے تامل اور غدر ہے، لیکن ترقی وہی قوم کر سکتی ہے جس میں دوسرا رجحان پہلے رجحان کے تابع ہو مگر اس اتباع کے لئے عقل یا سائنس کی کتاب میں کوئی فتویٰ نہیں ملتا اگر ہم اپنی زندگی پر غور کریں کہ وہ کس قدر ناپائدار اور کس قدر بے بنیاد ہے تو عقل صرف ایک فرض پر بہت زیادہ زور دیتی ہے جس کے سامنے باقی خیالات ہیچ ہیں۔ اس کی ہدایت یہی ہے کہ جہاں تک ممکن ہو عمر کے ان چند لمحوں کو کام میں لایا جائے اور حتی الوسع ان سے فائدہ اٹھایا جائے۔ انسان تکلیف سے بچے، راحت حاصل کرے۔ اور یہ چند دن جو ہمیں مستعار ملیں ہیں، آرام سے بسر ہو جائیں۔ اور اسی خیال سے انسان دولت کماتا ہے۔ جن سے عیش و راحت اور لطف نصیب ہو۔ اگر یہ رجحان بے روک ٹوک ترقی کرتا رہے تو انسانی حرمتی رک جائے اس لئے اسے ایک دوسرے رجحان کے تابع ہونا پڑتا ہے مذہبی رجحان غالب رہا اور عقل اس کے تابع رہی عقل بے شک ہماری رہبر و رہنما ہے۔ لیکن اس کا احاطہ محدود اور اس کی نظر تنگ ہے، اور اس لئے ضرورت ہے ایک ایسی ہدایت کی جو اس سے آگے ہمیں لے جائے۔ اور یہ کمی مذہب سے پوری ہوتی ہے۔"[1]

---

[1] مقدمہ معرکہ سائنس و مذہب، ص ۵۴.

دین ومذہب کے حوالے سے کچھ عصری مفاہیم کا جائزہ

دین ومذہب کی حقیقت اور اس کا کچھ تعارف تو اسی باب کے شروع میں کیا گیا ہے، وہی دین کی اصل حقیقت وماہیت ہے جس کا پہلے تفصیلی ذکر کیا گیا ہے اور ایک انسان کو اسی پر کاربند رہنا چاہئے لیکن بعد کے ادوار میں جب دیگر تمام ابواب کی طرح دین کے معاملے میں کردار وعمل سے زیادہ گفتار وبیان پر اکتفاء کیا جانے لگا، تو بہت سے اہل مغرب مفکرین نے بھی اس کو اپنی سوچ وفکر کا موضوع بنایا، اور ان میں سے کئی افراد نے اس کو اپنے بحث وتحقیق کا مآخذ قرار دیا، لیکن وحی کی بیش بہا دولت سے استفادہ نہ کرنے بلکہ اس کو درخود اعتناء نہ سمجھنے کی وجہ سے ان کا تصور دین ومذہب اس مفہوم کے برخلاف تھا جس کی طرف وحی انسانیت کی رہبری ورہنمائی کرتی ہے اور جو پہلے تفصیل سے سے ذکر کیا گیا ہے۔

اہل مغرب مفکرین نے دین ومذہب کے متعلق کیا خیالات قائم فرمائیں اور ان کا تصور دین ومذہب کیا تھا؟ اس حوالے سے ان کی بحث وتحقیق کا حاصل کیا ہے؟ یہ ایک طویل موضوع ہے جس کو یہاں ذکر کرنا غیر ضروری معلوم ہوتا ہے۔ شیخ خزعل ماجدی نے اپنی طویل کتاب "علم الأدیان" میں [1] اور شیخ عبد اللہ دراز رحمہ اللہ نے اپنی کتاب "الدین" میں [2] اس پر تفصیلی گفتگو فرمائی ہیں اور دین کے مفہوم متعین کرنے میں متعدد مغربی اہل قلم کے اقوال ونقول ذکر فرمائے ہیں، اہل علم کو اس کی طرف مراجعت کرنا مفید ہے۔ یہاں ان افکار کا حاصل، ان کی غلطی اور اس غلطی کا منشا متعین کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

---

[1] علم الأدیان، الفصل الأول، ص ۲ تا ۴ .

[2] الدین للشیخ العلامة عبد الله دراز، ص ۳۰.

مذہب کی حقیقت سے متعلق چند غلط تصورات

دین اسلام اور اس کی تعلیمات وہدایات سے دوری اور مغربی ترقی کے یلغار جیسے عناصر کے چھاجانے کے بعد مسلمانوں کے بہت سے طبقات میں دین ومذہب کا حقیقی تصور ڈگمگانے لگا، عالم اسلام کے مختلف ملکوں اور قوموں پر مختلف حالات وادوار گزرتے گئے، اور اس دوران اپنے اپنے حالات ونفسیات وغیرہ عناصر کے مطابق دین ومذہب کے مختلف مفاہیم مقرر ہوتے لگے، جن میں کچھ تو شعوری طور پر تھے اور کچھ یوں ہی لاشعوری طور پر متعین ہوتے گئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ امت میں مجموعی طور پر تو دین ومذہب کا تصور بالکل وہی برقرار رہا جو دین اسلام کا بتلایا ہوا تھا لیکن مسلمانوں کے ایک کثیر طبقے کے دل ودماغ میں وہ مفہوم برقرار نہ رہا بلکہ اس میں مختلف طرح سے تبدیلیاں اور محدودیت پیدا ہوتی چلی گئی۔

ایسے غلط تصورات تو بہت ہیں اور آج بھی اس کی تعبیر وتشریح کا سلسلہ کچھ تھما نہیں ہے، جناب محمد حسن عسکری صاحب مرحوم نے اختصار کے ساتھ ایسے مختلف تصورات جمع کئے ہیں، یہاں انہی میں سے چند تصورات کو ذکر کرنے پر اکتفاء کیا جاتا ہے، وہ لکھتے ہیں:

"۱: یہ بات نہ سمجھنا کہ مذہب کے تین لازمی اجزاء ہیں: عقائد، عبادات اور اخلاقیات۔ اور ان اجزا کی اہمیت بھی اسی ترتیب سے ہے ان تین میں سے کسی ایک یا دو کو لے لینا اور باقی چھوڑ دینا۔

۲: عقائد کو مذہب کا لازمی جزء نہ سمجھنا (یہ ذہنیت پروٹسٹنٹ مذہب والوں نے پیدا کی ہے۔ خصوصا انگلستان اور امریکہ کے لوگوں نے) اسلام کے عقائد کو بھی Dogma

کہنا (یہ لفظ رومن کیتھلک عقائد کے لئے استعمال ہوتا ہے اس فرقے میں پوپ کو ایک فرد کی حیثیت سے نہیں، بلکہ اپنے منصب کے اعتبار سے اور اپنے مشیروں سے صلاح لینے کے بعد عقائد میں ترمیم اور اضافے کا حق حاصل ہے اسی معنی میں علماء پر الزام لگایا جاتا ہے کہ وہ پادری بن کے بیٹھ گئے ہیں اور اسی معنی میں اسلامی عقائد کو بھی تحقیرا Dogma کہا جاتا ہے)

۳: یہ سمجھنا کہ عقائد میں وقتاً فوقتاً تبدیلی ہوسکتی ہے۔

۴: عقائد کو ضروری تو سمجھنا مگر ساتھ یہ بھی کہنا کہ عقائد میں صداقت نہیں ڈھونڈنی چاہیے کیونکہ عقائد تو محض جذباتی تسکین کے لئے ہیں۔

۵: عقیدے کو محض جذباتی چیز سمجھنا اور عقیدے کو منجمد جذبہ کہنا کبھی تعریف کے لئے کبھی تحقیر کے لئے۔

۶: عبادات کو محض رسوم سمجھنا اور رسوم ہی کی حیثیت سے قبول یا رد کرنا۔

۷: اخلاقیات کو مذہب کا لازمی جزء نہ سمجھنا۔

۸: اخلاقیات ہی کو پورا مذہب سمجھنا اور مذہب کو صرف ایک اخلاقی نظام کہنا (اس خیال کا آج کل ہمارے یہاں بہت ترویج ہو رہی ہے)۔

۹: تصوف کو صرف محض اخلاقی تربیت کا ذریعہ سمجھنا۔

۱۰: مذہب کو صرف ایک معاشرتی ادارہ سمجھنا مذہب کو معاشرے کی تنظیم کے ذرائع میں سے ایک ذریعہ کہنا۔

۱۱: یہ سمجھنا کہ خارجی اور مادی ماحول کو بہتر بنانے سے آدمی ذہنی اور روحانی طور پر بھی ترقی کرتا ہے، بلکہ یہاں تک کہنا کہ مذہب کا مقصد ہی یہ ہے کہ انسانی زندگی (یعنی مادی زندگی) کو بہتر بنائے۔

۱۲: مذہب کا مقصد معاشرتی بہبود Social welfare بتانا یا قومی خدمت حالی مرحوم کا نظم:

ان سے کہہ دو ہے مسلمانی کا جن کو ادعا
قوم کی خدمت میں ہے پوشیدہ بھید اسلام کا
وہ یہی خدمت یہی منصب ہے جس کے واسطے
آئے ہیں دنیا میں سب نوبت بہ نوبت انبیاً
قوم کی خدمت میں کر دیں اپنی عمریں جب تمام
تب فرائض سے نبوت کے ہوئے عہدہ برآ[1]

۱۳: یہ کہنا کہ مذہب انسان کے لئے ہے، انسان مذہب کے لئے نہیں۔

۱۴: یہ سمجھنا کہ مذہب کا مقصد کردار کی تعمیر ہے، اور کردار سے وہ افعال اور اعمال مراد لینا جو معاشرتی زندگی کے لئے مفید ہوں۔

۱۵: مذہب کو صرف جذباتی تسکین کا ذریعہ بتانا اور عقائد، عبادات اور اخلاقیات سب کو ثانوی چیز سمجھنا۔

۱۶: مذہب خصوصاً تصوف کو انسانی ہمدردی یا انسانی دوستی کا ایک طریقہ سمجھنا۔

---

[1] اردو کی آٹھویں کتاب برائے ہشتم سے نقل۔

۱۷: مذہب میں مغربی اشتراکی تصورات اور مساوات کا داخل کرنا اور مساوات سے یہ مراد لینا کہ سارے انسان ہر حیثیت سے مساوی ہیں۔"[1]

غلط تصورات کی اساس وبنیاد

ان حضرات نے دین ومذہب کے جو مختلف تصورات اور متعدد مفاہیم متعین کئے ہیں، ان میں سے بعض چیزیں تو ایک حد تک درست ثابت ہو سکتی ہے، لیکن اکثر تصورات غلط اور بے جا ہیں اور ان غلط تصورات کے درمیان میں قدرِ مشترکہ کے طور پر یہ بات واضح ہے کہ دین کے کسی ایک یا چند پہلوؤں کو لے کر اسی کو مکمل دین خیال کیا جاتا ہے، دین کے کامل تصور کو پیش نہیں کیا جاتا بلکہ اس کے چند اجزا کو مکمل دین تصور کیا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسا تصور ناقص وناتمام ہی ہوتا ہے اور ایسے تصورات سے کسی چیز کی پوری حقیقت وماہیت سامنے نہیں آتی۔

شاید اس غلطی کی یہ توجیہ درست ہوسکے کہ جس دین ومذہب سے ان کا واسطہ پڑا تھا، وہ درحقیقت ایسا ہی تھا اور ان لوگوں کو معیار قرار دیکر دوسرے ادیان کو بھی اس پر قیاس کرنا چاہا۔ حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہما الصلاۃ والسلام کے وصال فرمانے کے بعد جن غیر معصوم ہاتھوں اور خیانت کے عادی لوگوں کے پاس یہودیت ونصرانیت کی کتابیں اور تعلیمات وہدایات پہنچیں، ان کی طرح طرح کی زیادتیوں اور تحریفات کی بدولت ان دینوں اور ان کی کتابوں کی اصل شکل وصورت بالکل بدل دی گئی اور چلتے چلتے ان ادیان نے ایسی ہیئت اختیار کیں کہ شاید جس کے بعد کوئی فلسفی مزاج محقق یا انصاف

---

[1] جدیدیت، ان مغربی تصورات کی فہرست جن سے دین کے بارے میں غلط فہمیاں اور گمراہیاں پیدا ہو جاتی ہیں، ص ۱۰۰۔

پسند عقل مند ان کو "دین حق" کے طور پر ماننے کے لئے آمادہ ہو سکے اور نہ ہی اس کے ساتھ محبت، وارفتگی اور تقدس وعقیدت بسر اباندھ سکتا ہے، اس لئے اگر ایسے لوگ اگر دین کا کوئی ناقص یا نامعقول تصور پیش کریں تو شاید کچھ زیادہ جرم کی بات نہ ہو۔ دین اسلام اگرچہ اپنی اصل شکل اور واقعی صورت میں موجود و محفوظ ہے لیکن چونکہ عملی طور پر پوری دنیا اس کی واقعی سیادت وقیادت کی نعمت سے محروم تھی، اس لئے شاید اس کی طرف کوئی زیادہ التفات نہیں کیا ہوگا یا دین اسلام اور اس کے پیروکاروں کے ساتھ مخاصمانہ رویہ پیدا ہو جانے کے بعد عصبیت کی وجہ سے اس پر غور کرنے اور قریب سے دیکھنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کیں۔

الغرض حقیقی وجہ خواہ کچھ بھی ہو لیکن یہودیت ونصرانیت جس دور سے گزر رہے تھے، ان کے مطابق ان لوگوں کا تجزیہ کچھ زیادہ بعید از عقل وانصاف نہ تھا، تاہم ان کی یہی بنیادی اور اساسی غلطی تھی کہ دین اسلام سمیت دیگر تمام ادیان ومذاہب کو بھی اپنے تحریف شدہ مذاہب پر قیاس کیا اور سب ادیان کو ایک ہی ترازو میں تولنے کی جسارت کی جو ظاہر ہے کہ بے انصافی اور خلاف تحقیق کام ہے۔

اس غلطی کا ایک بھیانک نتیجہ یہ ثابت ہوا کہ دین ومذہب کا حقیقی مفہوم اور درست تصور نظروں سے اوجھل ہو گیا، انسانیت کے نام جو اس کا اصل پیغام تھا وہ بھی پوشیدہ ہو گیا اور اس کے بعد جو کچھ باقی رہا، وہ اس قابل نہ تھا کہ قدم قدم پر انسانیت کی رہبری کا فریضہ انجام دے سکے اور دکھی انسانیت کے ہر کوچہ مصروفیت میں اس کے ساتھ رہ کر درست رہنمائی کا کام کر سکے اور انسانی زندگی کے ہر ہر شعبے میں اس کے مشکلات ومسائل کا مداوا کر سکے۔ دوسری طرف چونکہ انسان اپنی فطرت سے حریص واقع ہوا ہے

اس لئے جب اس کے زعم میں یہ بات راسخ ہوگئی کہ مذہب سے میرے یہ مسائل حل ہونے کے نہیں ہیں تو اس کے سامنے یہ سوال کھڑا ہوا کہ پھر وہ کیوں مذہب کی پابندی کا طوق گلے کا ہار بناتا پھرے، اس لئے پھر تو خواہشات کے زیر نکیل رہ کر من چاہی زندگی گزارنا ہی عافیت کدہ معلوم ہوتا ہے۔ یہی سے دین بے زاری اور الحاد کا دریاب پھوٹنا شروع ہوا۔

یہ تو مغربی مفکرین اور ان کی غلطی کا باعث اور پھر اس کا نتیجہ وانجام ہے۔ جہاں تک مشرقی ممالک کے محققین ہیں تو ان میں سے بھی ایک خاصی ضخیم تعداد ان لوگوں کی ہے جو مغربی مفکرین کی بعض بعض باتوں سے شعوری یا لاشعوری طور پر مرعوب یا متاثر ہوئے ہیں اور اسی کا نتیجہ ہے کہ دین ومذہب کے تعارف اور اس کا مفہوم ومصداق بیان کرنے میں ان کا زاویہ فکر واقعی اسلامی فکر سے ایک حد تک مختلف ثابت ہوا۔ یہاں مثال کے طور پر کچھ مفکرین کے نقول پیش کئے جاتے ہیں اور ساتھ اس کا بقدرِ ضرورت مختصر تجزیہ بھی کیا جاتا ہے۔

مذہب کی صداقت کا معیار "حالی" کے نظر میں

مولانا الطاف حسین حالی نے سر سید احمد خان کے حالات وتاریخ پر "حیاتِ جاوید" کے نام سے ایک ضخیم کتاب لکھی ہے، اس میں وہ ایک جگہ لکھتے ہیں:

"اس وقت تمام علمی دنیا میں مذہب کی صداقت کا معیار یہ امر قرار پایا ہے کہ جو مذہب حقائق موجودات اور اصول تمدن کے برخلاف ہو، وہ مذہب سچا نہیں ہوسکتا۔ اس معیار نے جو نتائج مذہب کے حق میں پیدا کئے ہیں، وہ یہ ہیں کہ تمام قومیں جو علمی اور تمدنی ترقی کی طرف متوجہ ہوئی ہیں، وہ سب رفتہ رفتہ مذہب سے دست بردار ہوتی جارہی ہیں۔ عیسائیوں نے بائیبل کو

اٹھا کر بالائے طاق رکھ دیا اور فی الواقع اگر وہ بائبل کے احکام یا نصیحتوں پر کاربند ہوتے تو ترقی کے میدان میں ان کا قدم رکھنا ناممکن تھا۔"[1]

تجزیہ: تمدن کے جو اصول و قوانین واقعۃً انصاف پسندی، راست بازی اور دیانت داری پر مبنی ہو، اسلام اس کا مخالف نہیں ہے اور کوئی اسلامی حکم اس سے متصادم نہیں ہے۔ یوں ہی "حقائق موجودات" کا اصل معنیٰ لیا جائے تو کسی چیز کی واقعی ثابت شدہ اور حقیقی حیثیت کے خلاف کیونکر اسلام تعلیم دے سکتا ہے؟ یہ دونوں باتیں اپنی جگہ مسلم ہیں اور کوئی سچا مذہب اس کے خلاف نہیں ہو سکتا، کیونکہ ان باتوں کی مخالفت کذب بیانی اور دروغ گوئی کی دلیل ہے جس سے مذہب کی بنیاد متزلزل ہو جاتی ہے اور ایک غلط بیانی کے ثابت ہونے کے بعد پورا دین وایمان ہی مشکوک ومخدوش ہو جاتا ہے۔

لیکن اصل مسئلہ یہ ہے کہ یہ الفاظ وعبارات خاص ان معانی میں استعمال نہیں کئے جاتے، چنانچہ اس فکر کے علمبردار جناب سر سید احمد خان تھے (جن کی حیات وتعلیمات کو اجاگر کرنا مولانا حالی کی اس کتاب کا اصل موضوع ہے) اور ان کی تحریرات سے واضح ہو جاتا ہے کہ کوئی چیز جب مغرب میں قانون کا درجہ پا لیتی ہے تو وہ مسلم اصول تمدن کی فہرست میں شمار ہونی شروع ہو جاتی ہے، اسی طرح وہاں کے سائنسدان جب کسی چیز کے حقیقت ہونے کا دعویٰ کرنے لگ جاتے ہیں تو وہ حقائق موجودات کی روپ دھار لیتی ہے اور پھر دین ومذہب اگر ان جیسی باتوں سے تصادم یا تضاد اختیار کرتا ہے تو درج بالا ضابطے کے سہارے مذہبی دلائل کو پہلے تو غیر ثابت قرار دینے کی کوشش کی جاتی ہے اور

---

[1] حیات جاوید، ج ۲ ص ۱۵۰۔

اگر کہیں ایسا ممکن نہ ہوسکے تو ان میں ہیرا پھیری کر کے "اصول تمدن" اور "حقائق موجودات" کے مطابق کرلیا جاتا ہے اور یوں اس مذہبی تعلیم و حکم کے باقی رکھنے کا وجہ جواز فراہم ہو جاتا ہے۔

اب یہ الفاظ تو بڑے ہی معصوم ہیں اور کہنے کو تو اس میں کسی عقل مند کا اختلاف نہیں ہو سکتا، لیکن درحقیقت کتنے ہی دور رس نتائج اور بھیانک اثرات کے حامل ہیں جس کے نتیجے میں دین ومذہب مغربی فکر وتمدن کا تابع فرمان اور اسیر زندان بن جاتا ہے، حالانکہ مذہب کی حیثیت تابع ومحکوم کی نہیں ہے بلکہ متبوع وحاکم کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سرسید احمد خان اور اس کے نہج پر چلنے والے لوگوں کے لئے بہت سی ایسی دینی باتوں کو رد کرنا پڑا جو قطعی دلائل سے ثابت تھی اور اگر کہیں کسی وجہ سے اس کی قدرت نہ رکھ سکے، تو تاویل وتحریف تو ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل بن چکا تھا۔

سرسید احمد خان نے ایک مکتوب میں اپنے زعم کے مطابق اسی نوعیت کے کچھ اصول وضوابط لکھے تھے، حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمہ اللہ نے اس کا تفصیلی جواب لکھا تھا، جو بعد میں "تصفیۃ العقائد" کے نام سے رسالے کی شکل میں شائع ہوا۔ اس میں مولانا نانوتوی رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں:

"دوم: کلام خداوندی اور کلام نبوی صلی اللہ علیہ وسلم جیسے مخالف حقیقت اور مخالف واقع نہیں ہو سکتا ایسے ہی حقیقت اور واقع کے دریافت کرنے کی صورت اس سے بہتر کوئی نہیں کہ خدائے تعالی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام کی طرف رجوع کیا جائے۔ سو اگر کوئی طریقہ دربارہ اخبار واقع وحقیقت مخالف کلام اللہ اور احادیث صحیحہ ہو تو کلام اللہ اور احادیث کے وسیلہ سے اس کی تغلیط کرسکیں گے پر کلام اللہ اور احادیث کی تغلیط اس طریقہ کے بھروسے نہیں

کر سکتے اس صورت میں اگر اشارہ عقل معارضِ اشارہ نقل ہو تو ہرگز قابل اعتبار نہیں۔ غرض عقل کی بات یہ ہے کہ کلام اللہ اور احادیثِ صحیحہ نمونہ صحت اور سقم دلائل عقلیہ سمجھے جائیں۔ نہ برعکس۔ علی ہذا القیاس مضمونِ متبادر کلام اللہ وحدیث کو جو باعتبار قواعد صرف ونحو بدلالت مطابقی سمجھے جاتے ہوں اصل مقرر کرکے دلائل عقلیہ کو اس پر مطابق کریں اگر کھچ کھچا کر بھی مطابق آجائے تو فبہا ورنہ قصورِ عقل سمجھیں یہ نہ ہو کہ اپنے خیالات واوہام کو اصل سمجھیں اور کلام اللہ وحدیث کو کھینچ تان کر اس پر مطابق کریں۔

سوئم: اس میں بھی کچھ شک نہیں کہ قرآن مجید کا کوئی کلمہ خلاف واقع نہیں مگر اس میں بھی کچھ شک نہیں کہ اس کبرنے کے لئے کلیہ کوئی صغرے جزئیہ بوسیلہ عقل دریافت کرلینا ہم سے ہیچمدانوں کا تو کیا حوصلہ۔ جناب سید صاحب اور مولوی مہدی علی خان صاحب کا بھی کام نہیں یعنی بوسیلہ عقل یوں نہیں کہہ سکتے کہ ہذا حقیقتہ او واقع اور کہیں تو تاوقتیکہ کلام اللہ کے یہ معنے متبادر مطابقی کے مطابق ہے تو بر سر و چشم ورنہ کالائے زبون بریش خاوند مگر یہ یاد رہے کہ معنی مطابقی سے زیادہ لینے کی اجازت نہیں ہاں اگر کوئی اور دلیل نقلی یا عقلی سے ایسی بات ثابت ہوجائے جو معنی مطابقی کی مخالف نہیں تو کچھ مضائقہ نہیں۔ غرض جاءنی زید سے زید کا فقط آنا ثابت ہوگا۔ سوار ہونے یا پیادہ آنے سے سروکار نہیں۔"[1]

کامل مذہب کی شرائط علامہ شبلی کی نظر میں

علامہ شبلی نعمانی صاحب رحمہ اللہ ہمارے ہندوستان کے ان بڑے اور نامور علماء میں سے ایک تھے جن کی دینی وملی خدمات سے مسلمانوں کو بڑا فائدہ پہنچا ہے اور اس سلسلہ میں انہوں نے متعدد ایسے کارنامے انجام دیئے ہیں، جو قابل دید بھی ہے اور لائق داد بھی۔ تاہم اس کے ساتھ ساتھ مستشرقین اور اہل اعتزال کی کتابوں اور علمی ذخائر

---

[1] "مقالات حجۃ الاسلام ج ۲ ص ۳۲۸ جواب دوم وسوم" ملاحظہ فرمائیں۔

کے ساتھ بھی آپ کا بڑا ربط و تعلق رہا ہے اور اگر چہ بہت سی جگہ وہ مستشرقین کے خدشات واعتراضات کا بڑا مدلل اور پُر مغز جواب دیتے نظر آتے ہیں لیکن بایں ہمہ مختلف عناصر کی وجہ سے ان میں کچھ "فکری و عملی شذوذ" بھی تھے۔ مذہب کے حوالہ سے وہ اپنی مشہور کتاب "علم الکلام" میں تحریر فرماتے ہیں:

"کامل اور ابدی مذہب کے لئے جو باتیں ضروری ہیں، یہ ہیں:

۱: مذہب کی صحت کا مدار عقل قرار دیا جائے، نہ تقلید۔

۲: کوئی عقیدہ مذہب مذہبی عقل کے خلاف نہ ہو۔

۳: عبادات کے یہ معنٰی نہ قرار دیئے جائیں کہ وہ مقصود بالذات ہیں اور خدا ہمارے تکلیفات شاقہ اٹھانے سے خوش ہوتا ہے بلکہ عبادات سے خود نوع انسانی کا فائدہ مقصود ہو اور اعتدال سے متجاوز نہ ہوں۔

۴: دینی اور دنیوی، فرائض کو اس اعتدال کے ساتھ قائم کیا جائے کہ ایک سے دوسرے کو ضرر نہ پہنچے بلکہ ایک دوسرے کا دست وبازو بن جائے۔: مذہب تمدن کی اعلیٰ سے اعلیٰ ترقی کا ساتھ دے سکے بلکہ خود اس ترقی کا راستہ دکھائے"۔[۱]

تجزیہ: مولانا الطاف حسین حالی صاحب کی عبارت کے نیچے جو تجزیاتی بات لکھی گئی تھی، وہ یہاں بھی مد نظر رہنی چاہئے اور اس کا حاصل یہی ہے کہ ظاہری طور پر اس عبارت میں کوئی زیادہ سقم نہیں ہے لیکن ان سے جو کچھ مراد لیا جاتا ہے اور جس بات کا تاثر دیا جاتا ہے وہ حد درجہ خطرناک اور بھیانک ہے، اس کا نتیجہ وہی ظاہر ہوتا ہے جو حالی

---

[۱] علم الکلام اور الکلام، ص ۱۷۔

صاحب کی عبارت کے تجزیہ میں ذکر کیا گیا ہے کہ دینی تعلیمات واحکام ہمارے عام عقول خاص کر مغربی عقل وتمدن کے تابع بن جاتی ہیں۔

کسی دین کی حقانیت کا معیار ومدار

حضرت انسان کے خیالات وتصورات اور اعمال وکردار میں ایک حصہ ان چیزوں کا ہوتا ہے جو درست اور صحیح سمت پر واقع ہوتے ہیں، دوسرا حصہ ان امور کا ہے جن کا رخ غلط ہوتا ہے اور وہ حقائق وانصاف سے دور ہوتے ہیں۔ ان تمام چیزوں کا ہم آئے دن اپنے آپ میں بھی اور دیگر بنی نوع انسان میں بھی مشاہدہ کرتے رہتے ہیں۔ اس قسم کے مختلف ومتضاد نتائج کی بنیاد واساس، انسان کی وہ فطری صلاحیتیں ہیں جو قدرت نے اس کے اندر ودیعت رکھی ہوئی ہوتی ہیں، انہی قوتوں کے بل بوتے اس طرح مختلف نتائج کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور وجہ اس کی یہ ہوتی ہے کہ قوتیں اس کی اختیاری اور خانہ زاد نہیں ہوتیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی اور اسی کی عطاء کی ہوئی ہیں، اس نے اپنی حکمت ومنشا کے مطابق ایسی قوتیں انسان کے اندر ودیعت کے طور پر رکھ دی ہے جن سے مختلف قسم کے اعمال ونتائج صادر ہوتے ہیں۔ اس کے بالمقابل اللہ تعالیٰ کے احکام واختیارات ہیں جہاں کسی قسم کی کمزوری، غلطی یا نقص کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

اب دین ومذہب کا اتارنے والا اور اس کے احکام وتعلیمات مقرر فرمانے والی ہستی تو چونکہ اللہ تعالیٰ کی ذات ستودہ صفات ہی ہے، اس لئے اس کے متوازن ہونے نہ ہونے یا درست ہونے نہ ہونے کا سوال ہی بے بنیاد اور بے محل ہے، کیونکہ اگر کسی دین کا اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہونا یقینی ہو اور اس کے باجود اس میں کوئی نقص یا خامی رہے تو اس خامی کی نسبت دین نازل کرنے والے ہی کی جانب ہوگی جبکہ اللہ تعالیٰ ہر قسم کی کمزوری

وعیب سے یقیناپاک ہے، لہٰذا حق مذہب کے صحیح یاغلط ہونے کاسوال اٹھاناہی بے فائدہ ہے۔ بلکہ حقیقت کی بات تو یہ ہے کہ حق دین ومذہب ہی وہ معیار وترازو ہے جس کے ذریعے مختلف چیزوں کو تولا اور پرکھاجاسکتاہے اوراس کا درست ہونانہ ہونا معلوم کیاجاسکتا ہے۔اس لئے کسی دین ومذہب کی حقانیت کے لئے یہی بات کافی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل کردہ ہے، جو چیز بھی اس کی طرف سے نازل ہوگی وہ صحیح اور درست ہی ہوگی، اس کومزید کسی اور پیمانے پر ناپنے اور پرکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔

حقانیت معلوم کرنے کے معاصر معیارات

لیکن تہذیب وتمدن کے میدان کارزار میں جو قوم جنگ ہار جاتی ہے، اس کا دل ودماغ بھی رفتہ رفتہ مغلوب ہوجاتاہے اور قلم وقرطاس کے عالم میں بھی وہ مفتوح ومقہور ہوجاتے ہیں اور خیالات وتصورات کے جہاں بھی محدود اور نہایت محدود ہوکے رہ جاتے ہیں۔اسی مغلوبیت کے عالم میں ملت کے بہت سے بہی خواہوں کی طرف سے مذہب کی حقانیت کے لئے مختلف معیارات قائم کئے جانے لگے۔کسی نے یہ معیار مقرر کیاکہ سچا مذہب وہی ہے جو سائنسی تحقیقات کے خلاف نہ ہو، کسی نے اخلاق حسنہ کی تعلیم پر حقانیت کامدار رکھا جبکہ کسی نے یہ ضابطہ مقرر فرمایاکہ وہ اپنے پیروکاروں کے دنیوی ترقی کی راہ میں رکاوٹ نہ ڈالے، اور دنیاوآخرت کی کامیابی وترقی کاضامن ہو۔وغیرہ وغیرہ۔

ان معیارات کی نوعیت

حقیقت یہ ہے کہ یہ ثانوی درجہ کی چیزیں ہیں اور محض ان امور کی بنیاد پر کسی دین ومذہب کی حقانیت کافیصلہ کرنادرست نہیں ہے۔اصل دیکھنے کی چیز اگر ہے تو یہی ہے کہ وہ دین واقعۃ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل کردہ ہے یانہیں؟اگر جواب اثبات میں ہے تو

یہی کافی ہے، اور مزید کسی خوبی دیکھنے کی ضرورت اس لئے نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ حکیم ہے اور اس کی تعلیم حکمت ہی پر مبنی ہوگی، گو بعض امور کی حکمتوں تک ہمارے محدود ذہنوں کی رسائی نہ ہونے پائے، اور اگر اس کا جواب نفی میں ہے تو ایسی باتیں اگر درست ہوں اور درج بالا ترازوں میں تولنے کے بعد اس میں حقانیت کا گمان بھی ہو جائے تو بھی اس کو ایک نظریہ وفلسفہ یا فکر و نظر کے درجہ میں تو قبول کیا جاسکتا ہے لیکن دین ومذہب کے عنوان سے اس کو قبول نہیں کیا جاسکتا۔

قرآن کریم کا طرزِ تعلیم

قرآن کریم کے اندازِ بیان اور اسلوبِ نگارش سے بھی بظاہر یہی سبق ملتا ہے، مثال کے طور پر سورۃ ہود میں ہے:

﴿ كِتَابٌ أُحْكِمَتْ آيَاتُهُ ثُمَّ فُصِّلَتْ مِنْ لَدُنْ حَكِيمٍ خَبِيرٍ ﴾[1]

ترجمہ: "یہ ایسی کتاب ہے کہ جس کی آیتیں حکیم خبردار کی طرف سے مستحکم کر دی گئی ہیں پھر مفصل بیان کی گئی ہیں"۔

سورۃ کہف میں فرمانِ ربانی ہے:

﴿الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي أَنْزَلَ عَلَىٰ عَبْدِهِ الْكِتَابَ وَلَمْ يَجْعَلْ لَهُ عِوَجًا قَيِّمًا لِيُنْذِرَ بَأْسًا شَدِيدًا مِنْ لَدُنْهُ ﴾[2]

---

[1] هود: آية ١.

[2] الكهف: آية ١، ٢.

ترجمہ: "سب تعریف اللہ کے لیے جس نے اپنے بندہ پر کتاب اتاری اور اس میں ذرا بھی کجی نہیں رکھی۔ ٹھیک اتاری تاکہ اس سخت عذاب سے ڈراوے جو اس کے ہاں ہے"۔

ان جیسی آیات میں مجموعی طور پر یہ تعلیم دی گئی ہے کہ قرآن کریم کی آیتوں میں کوئی لفظی یا معنوی کمزوری یا ٹیڑھاپن نہیں ہے، اس کی تعلیمات وہدایات میں کوئی کجروی اور نقص نہیں ہے۔ اس تعلیم کے ساتھ ہی اس بات کو بھی جوڑا گیا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل کردہ ہے جو بے کنار علم وخبر جیسی صفات سے متصف ہے۔ یہ اس دعویٰ کی ایک گونا دلیل کی طرف اشارہ ہے کہ جب یہ کتاب ایسی ہستی کی طرف سے یقیناً نازل کردہ ہے تو اس کے الفاظ ومعانی اور مفاہیم وتعلیمات میں کیونکر کمی کمزوری یا کجروی اور نقص آسکتا ہے! یہ یقین حاصل کرنے کے بعد، کہ یہ کتاب یا دین ومذہب اللہ تعالیٰ کا نازل فرمودہ ہے، دیگر ترازوں کے ساتھ اس کو تولنا اور اس پر حق ہونے نہ ہونے کا مدار رکھنا در حقیقت اللہ تعالیٰ کی صفات سے ناواقفیت کی نشانی ہے۔

دین میں تحریف وفساد کیونکر پیدا ہوتا ہے؟

جس طرح آسمان سے جب پانی نازل ہوتا ہے تو صاف ستھرا اور خوش ذائقہ ہی ہوتا ہے لیکن زمین پر پہنچنے کے بعد مختلف عناصر کی وجہ سے اس کی صفائی ستھرائی بھی متاثر ہوجاتی ہے اور ذائقہ میں بھی تفاوت تبدیلی واقع ہوجاتی ہے، یوں ہی آسمان سے نازل ہونے والا اصل دین بھی ہر قسم کی کدورت، میل کچیل سے محفوظ ہوتا ہے لیکن یہاں آجانے کے بعد بعض اوقات اس میں ترمیم واضافہ کرنے کی کوششیں کی جاتی ہیں اور انہی ترمیمات کی وجہ سے دین حق کی اصل رعنائی وشادمانی بسا اوقات پوشیدہ ہوجاتی ہے رہاں یہ

سوال کہ دین اور اس کی تعلیمات وہدایات میں بگاڑ کیوں پیدا ہو جاتا ہے؟ اس میں تبدیلی وتغیر واقع ہونے کے اسباب وعناصر کیا ہیں؟ یہ ایک ایسا سوال ہے جو بہت ہی غور وفکر کا متقاضی ہے اور دین کے حوالہ سے فکر مند دل ودماغ سے غیر معمولی غور وفکر کا طالب ہے۔

حضرت امام شاہ ولی اللہؒ کی تحقیق

برصغیر کے مشہور ومعروف مفکر حضرت امام شاہ ولی اللہ صاحب رحمہ اللہ نے اپنی مایہ ناز کتاب "حجۃ اللہ البالغہ" میں اس پر تفصیلی بحث فرمائی ہے اور ایسے سات (۷) اسباب کی نشاندہی فرمائی ہے جن کی وجہ سے دین حق میں بگاڑ وتحریف پیدا ہو جاتا ہے، ان سات اسباب کی تفصیل درج ذیل ہے:

پہلا سبب: تہاون:

اس کا حاصل یہ ہے کہ دین سے وابستہ افراد دین کے معاملہ میں سستی وکاہلی سے کام لیں اور جس قدر اہمیت واہتمام کا وہ لائق ہے، اس میں کوتاہی برتی جائے۔ اس کے مختلف اسباب ہوسکتے ہیں: بعض اوقات امت دین کے احکام وتعلیمات آگے نقل کرنے میں کوتاہی برتنا شروع کرتی ہے، بسا اوقات اس پر عمل کرنے میں سستی کا مظاہرہ کرتی ہے جبکہ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ خواہشات ومفاد کی وجہ سے دینی ہدایات میں اپنے پسند کے مطابق تاویلات کا سلسلہ شروع کیا جاتا ہے اور ایک سبب یہ بھی ہوتا ہے کہ امت کے اندر دینی منکرات کا غلبہ ہو جاتا ہے اور ذمہ دار افراد اس پر نکیر کرنا چھوڑ جاتے ہیں۔

دوسرا سبب تعمق:

حد سے زیادہ گہرائی میں جانا۔ اس کی صورت یہ ہے کہ دین کسی کام کے کرنے کا حکم دے یا اس کے کرنے سے ممانعت کرے، اور اس دین کے پیروکار اپنی طرف سے اس کا اہتمام کرنا شروع کریں کہ جہاں بھی کوئی چیز اس کام کے مشابہ دیکھی تو اس کے لئے بھی وہی حکم ثابت کریں اور جہاں ذرا سا اشتباہ یا تردد پیدا ہو جائیں وہاں بے جا سختی سے کام لیکر اس کو ممنوع سمجھیں۔ مثال کے طور پر کوئی دین یہ حکم دیدے کہ روزہ رکھے اور اس دوران کھانا پینا اور جماع کرنا چھوڑ دو، تا کہ نفس قابو میں آئے، اب کوئی پیروکار روزہ کے دوران پانی کے قریب جانے اور بیوی سے ضروری نوعیت کے تعلق اور سحری کھانے پر بھی یہ کہہ کر قدغن پابندی کرے کہ اس سے نفس کو تقویت حاصل ہوتی ہے۔

تیسرا سبب تشدد:

یعنی بے جا سختی سے کام لینا۔ دین ومذہب جن باتوں کا حکم نہ دے، اس کو عبادت کے طور پر اپنانے کا التزام واصرار کرنا۔ مثال کے طور پر ہمیشہ روزہ رکھنا، پابندی کے ساتھ پوری پوری رات عبادت کرنا، شادی بیاہ سے مکمل پرہیز کرنا، وغیرہ۔ چنانچہ بہت سے نصاریٰ نے رہبانیت کے نام پر اس طرح پابندیاں اپنے اوپر عائد کر رکھی تھیں۔

چوتھا سبب استحسان:

اس کا حاصل یہ ہے کہ دینی تعلیمات وہدایات میں اپنی طرف سے مصالح نکالنا اور انہی مزعومہ مصالح کے ساتھ شرعی احکام کو جوڑے رکھنا۔ مثال کے طور پر یہودیوں کو حکم ملا تھا کہ جو شخص زنا کرے، اس کو سنگسار کر دیں، انہوں نے خیال کیا کہ اس حکم کا مقصود تو معاصی سے روکنا تھا اور اب اس سے آپس میں جنگ ونفرت کی فضاء پیدا ہوتی ہے

جو زیادہ فتنہ وفساد کا موجب ہے، اس لئے اس کی بجائے زنا کرنے والے کا چہرہ کالا کر کے کچھ کوڑے لگوائے جائیں گے، اس سے مقصود بھی حاصل ہو جائے گا اور فساد سے بھی نجات حاصل ہو جائے گی۔ اس مزعومہ مصلحت کی بناء پر انہوں نے کئی احکام میں تحریف کر ڈالی۔[1]

پانچواں سبب رائے عامہ کی پیروی کرنا:

رائے عامہ کو حتمی سمجھنا اور اس کے مطابق اپنے دین ومذہب کی تعبیر کر ڈالنا۔ مذہبی تعلیمات وہدایات کو رائے عامہ کے سانچے میں رکھ کر پیش کرنا اور اگر کوئی مخالفت یا تضاد ظاہر ہو جائے تو دینی تعلیمات کو رائے عامہ کے مطابق کر ڈالنا۔

چھٹا سبب غیر معصوم کی تقلید کرنا:

دین کے معاملہ میں کسی غیر معصوم شخص کی تقلید و پیروی میں حد سے تجاوز کرنا، کہ اس کی بات کو بالکل حرف آخر سمجھا جائے اور اگر دین کا کوئی واضح حکم بھی اس کی رائے کے خلاف سامنے آئے تو بہر حال اسی کی رائے کو مقدم رکھا جائے۔

ساتواں سبب ادیان کا باہم خلط ملط کرنا:

اس کی صورت عام طور پر یہ ہوتی ہے کہ دیگر ادیان کے بعض حاملین دین قبول کریں اور اپنے سابقہ مذہب کی کچھ باتیں یہاں شامل کریں اور اس نئے دین کے حاملین لوگ ان پر نکیر کرنے سے چشم پوشی سے کام لیں۔

---

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمائیں: حجة الله البالغة، باب إحكام الدين من التحريف ج ۱ ص ۳۲۲.

اسباب تحریف کا حاصل

غور کیا جائے تو حاصل یہی نکلتا ہے کہ اہل دین و مذہب کی علمی یا عملی کمزوریاں اور کوتاہیاں ہی ایسی چیزیں ہیں جن کی وجہ سے دین حق کا اصل چہرہ روپوش ہو جاتا ہے اور اس کے حسین خدوخال میں تحریفات کے بدنماں نقطے ناموزوں داغ کی صورت اختیار کر جاتے ہیں، ان خود ساختہ تحریفات کی حیثیت ایسی ہوتی ہے جیسے ریشم کے حسین و نازک کپڑے میں مخمل کے ٹاٹ کا پیوند لگا یا جائے۔

علمی اور نظریاتی کمزوری تو یہ ہے کہ دین حق کو اپنے اصل مقام و مرتبے میں نہ رکھے، جس قدر غیر معمولی اہمیت، قربانی اور جان نثاری کا وہ مستحق ہے، اس کا قائل نہ تصور کیا جائے بلکہ نظریاتی طور پر اس میں کوتاہی برتی جائے، اس میں اپنی طرف سے نت نئی باتوں کو جگہ دیا جائے یا اس کی بعض تعلیمات و ہدایات کو اس میں سے خارج کر دیا جائے جس کو شریعت اسلامیہ کی اصطلاح میں "ابتداع" کہا جاتا ہے اور جس کی طرف خود نصوص میں متعدد اشارے پائے جاتے ہیں کہ اس سے دین حق کی عمارت گویا منہدم ہو جاتی ہے۔

عملی میدان کی کوتاہی یہ ہے کہ دینی احکام کی بجا آوری میں سستی و غفلت سے کام لیا جائے۔ پھر انفرادی کوتاہی تو گو بذات خود مضر اور خسارہ آخرت کا موجب ہے البتہ اس سے اجتماعی دینی اور ملی نقصان نہیں ہوتا، تاہم اجتماعی اور قومی سطح کی کوتاہی ایسی مجرمانہ حرکت اور باغیانہ اقدام کے مانند ہے جس سے فطرت عام طور پر اغماض نہیں کرتی بلکہ اس کا کچھ نہ کچھ بدلہ عموماً چکھایا ہی جاتا ہے، اسی بدلہ کی ایک شکل یہ بھی ہے کہ ایسے لوگوں کو دین حق کے صاف ستھرے تعلیمات سے کسی حد تک محروم کر دیا جاتا ہے۔ ایک

(مقطوع)روایت میں اس مضمون کی طرف بڑا باریک اشارہ فرمایا گیا ہے، چنانچہ مسند دارمی میں ہے:

عَنْ حَسَّانَ قَالَ: مَا ابْتَدَعَ قَوْمٌ بِدْعَةً فِي دِينِهِمْ إِلاَّ نَزَعَ اللهُ مِنْ سُنَّتِهِمْ مِثْلَهَا، ثُمَّ لاَ يُعِيدُهَا إِلَيْهِمْ إِلَى يَوْمِ الْقِيَامَةِ.[1]

ترجمہ: "جب بھی کسی قوم نے اپنے دین میں بدعت ایجاد کی تو اللہ تعالیٰ نے اس قوم سے اس جیسا سنت اٹھالیا، پھر قیامت تک اس کو واپس نہ کرے گا۔

قرآن کریم نے بھی اس کوتاہی کو اسی زمرے میں رکھا ہے اور اس کو "صد عن سبیل اللہ" یعنی اللہ تعالیٰ کے راستے اور دین حق پر چلنے سے ایک رکاوٹ قرار دیا گیا ہے، قرآن کریم میں ارشاد خداوندی ہے:

﴿وَلَا تَتَّخِذُوا أَيْمَانَكُمْ دَخَلًا بَيْنَكُمْ فَتَزِلَّ قَدَمٌ بَعْدَ ثُبُوتِهَا وَتَذُوقُوا السُّوءَ بِمَا صَدَدْتُمْ عَنْ سَبِيلِ اللهِ وَلَكُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ﴾[2]

ترجمہ: "اور تم اپنی قسموں کو آپس میں فساد کا ذریعہ نہ بناؤ کبھی قدم جمنے کے بعد پھسل نہ جائے پھر تمہیں اس سبب سے کہ تم نے راہ خدا سے روکا تکلیف اٹھانی پڑے اور تمہیں بڑا عذاب ہو"۔

اس کی تفسیر میں ہے:

---

[1] مسند الدارمي ت الزهراني، كتاب علامات النبوة، باب اتباع السنة، ج ۱ ص ۹۰.

[2] النحل: آية ۹۴.

هذا نهي للذين بايعوا رسول الله صلى الله عليه وسلم على الإسلام ونصرة الدين عن نقض العهد، ويدلّ عليه قوله تعالى: وَتَذُوقُوا السُّوءَ يعني: العقوبة بِما صَدَدْتُمْ عَنْ سَبِيلِ اللهِ يريد أنهم إذا نقضوا عهدهم مع رسول الله صلى الله عليه وسلم، صدّوا الناس عن الإسلام، فاستحقّوا العذاب. وقوله تعالى: وَلَكُمْ عَذابٌ عَظِيمٌ يعني: في الآخرة.[1]

ترجمہ: یہ ان لوگوں کو وعدہ توڑنے سے منع کرتا ہے جنہوں نے رسول ﷺ کے ساتھ اسلام اور دین کی مدد کرنے پہ بیعت کی تھی، اور اس پر اللہ تعالیٰ کا یہ قول "وَتَذُوقُوا السُّوءَ یعني: العقوبة بما صَدَدْتُمْ عَنْ سَبِيلِ اللهِ" دلالت کرتی ہے، مطلب یہ ہے جب انہوں نے رسول ﷺ کے ساتھ وعدہ توڑا اور لوگوں کو اسلام سے منع کیا تو بس عذاب کے مستحق ہوئے۔ اور اللہ تعالیٰ کا یہ قول "وَلَكُمْ عَذابٌ عَظِيمٌ يعني: في الآخرة" یعنی تمہارے لئے آخرت میں بڑا عذاب ہے۔

"تفسیر ابن کثیر" میں ہے:

ثم حذر تعالى عباده عن اتخاذ الأيمان دخلا أي خديعة ومكرا، لئلا تزل قدم بعد ثبوتها: مثل لمن كان على الاستقامة فحاد عنها وزل عن طريق الهدى، بسبب

---

[1] زاد المسير في علم التفسير، النحل، آية ۹۴، ج۲ ص۵۸۱.

الأيمان الحانثة المشتملة على الصد عن سبيل الله؛ لأن الكافر إذا رأى أن المؤمن قد عاهده ثم غدر به، لم يبق له وثوق بالدين، فانصد بسببه عن الدخول في الإسلام؛ ولهذا قال: ﴿وتذوقوا السوء بما صددتم عن سبيل الله ولكم عذاب عظيم﴾[1]

ترجمہ: "اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو قسموں کو دھوکہ اور مکر وفریب کا ذریعہ بنانے سے منع کیا، تاکہ قدم مضبوط ہونے کے بعد پھسل نہ جائے، ایسے شخص کی طرح جو استقامت پر کھڑا رہنے کے بعد جھوٹی قسموں کی وجہ سے اور اللہ کی راہ سے روکنے کی وجہ سے اس سے ہٹ جائے اور سیدھے راستے سے پھسل جائے، اس لئے کہ جب کافر یہ دیکھے گا کہ مسلمان نے اس کے ساتھ وعدہ کرنے کے بعد دھوکہ کیا تو کافر کو دین پر اعتماد نہ رہے گا تو یہ کافر اس کی وجہ سے اسلام میں داخل ہونے سے رک گیا"۔

اور یہ "اللہ کے راستے سے روکنا" ایسا گناہ ہے جو شریعت کی نگاہِ بصیرت میں بڑا خطرناک جرم ہے، ایک دوسری جگہ ارشادِ خداوندی ہے:

﴿وَصَدٌّ عَنْ سَبِيلِ اللهِ وَكُفْرٌ بِهِ وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَإِخْرَاجُ أَهْلِهِ مِنْهُ أَكْبَرُ عِنْدَ اللهِ وَالْفِتْنَةُ أَكْبَرُ مِنَ الْقَتْلِ﴾[2]

---

[1] تفسیر ابن کثیر ت سلامۃ، النحل، آیۃ ۹۴ ج ۴ ص ۶۰۰۔

[2] البقرۃ، آیۃ ۲۱۷۔

ترجمہ: "اور اللہ کے راستہ سے روکنا اور اس کا انکار کرنا اور مسجد حرام
سے روکنا اور اس کے رہنے والوں کو اس میں سے نکالنا اللہ کے نزدیک
اس سے بڑا گناہ ہے اور فتنہ انگیزی تو قتل سے بھی بڑا جرم ہے"۔

"صد عن سبیل اللہ" کا مطلب یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے راستے اور دین اسلام سے کسی کو روکا جائے یا اس کا ذریعہ بنا جائے، معلوم ہوا کہ امت کی عملی کوتاہی کی وجہ سے دیگر بنی نوع انسان دین اسلام کے قریب آنے سے رکنے کا سامان بن جاتا ہے۔

واقعی صورت حال اور مشاہدہ بھی اس بات کی حرف حرف تصدیق کرتا ہے چنانچہ مسلمانوں کی غلطیاں عموماً اور دینی رہنماؤں کی کوتاہیاں خصوصاً بہت سے لوگوں کے لئے دین اسلام کے آغوش محبت میں پناہ لینے سے مانع بن جاتی ہیں، اور اگر کسی قدر چاہت اور خواہش کے باوجود وہ ان عملی کمزوریوں کو دیکھ کر اسلام قبول کرنے سے نفور اختیار کر جاتے ہیں۔ بہت سے نومسلموں کے قبول اسلام کے واقعات میں یہ بات نمایاں طور پر ملتی ہیں۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

باب دوم:

اسلام کا ایک جامع تعارف

اسلام کا لغوی و اصطلاحی معنی

"اسلام" در اصل عربی زبان کا لفظ ہے جو س، ل اور م تین حروف سے بنا ہے، عربی میں یہ اس طرح استعمال ہوتا ہے "سلِم یسلَم سلاما و سلامۃ" اس کا بنیادی معنی ہے :(آفات و مصائب یعنی کمزوریوں اور عیوب وغیرہ سے) محفوظ رہنا، بچا رہنا۔ اسلام کا لفظ بھی اسی مادہ سے نکلا ہے جس کا معنی ہے: کسی کو امن و سلامتی دینا۔ کسی کو کوئی چیز حوالہ کرنا۔ امن و سلامتی میں داخل ہونا۔[1] دین و مذہب کے سیاق میں جب "اسلام" کا ذکر کیا جاتا ہے تو اس سے "ان تعلیمات و احکام کا مجموعہ ہے جو ہمارے پیارے رسول ﷺ اللہ تعالیٰ کی طرف سے لے کر آئے ہیں" انہی تعلیمات و ہدایات کے مجموعہ کو دین اسلام کہا جاتا ہے۔

دین اسلام کے مختلف شعبے اور ان کا تعارف

اسلام ایک جامع نظام زندگی اور مکمل ضابطہ حیات ہے جو انسانی زندگی کے ہر ہر شعبہ کو شامل ہے، اور انسانی زندگی کا کوئی ایسا گوشہ نہیں ہے جس کے متعلق دین اسلام نے اس کو بے یار و مددگار چھوڑا ہو، یا اس کی درست رہنمائی کرنے سے کہیں ہاتھ کھینچا

---

[1] القاموس الوحید، ص۷۹۔

ہو۔اب چونکہ انسانی زندگی کے مختلف مشاغل اور متنوع مصروفیات ہوتی ہیں جن میں کچھ انفرادی نوعیت کے کام ہوتے ہیں، اور کچھ امور کا تعلق باہمی اجتماع سے ہوتا ہے، اس لحاظ سے دین اسلام کے بھی مختلف "شعبے" بن جاتے ہیں، یہاں انہی شعبوں کو اجمال کے ساتھ بیان کرنا مقصود ہے۔

انسانی زندگی کے بنیادی طور پر پانچ شعبے ہیں: ۱:عقائد و نظریات۔ ۲: عبادات۔ ۳: اخلاق۔ ۴: آداب و معاشرت۔ ۵: معاملات۔ پہلی دو چیزیں بنیادی طور پر انفرادی زندگی کے ساتھ تعلق رکھتی ہیں، اور آخری دو چیزیں اجتماعی زندگی سے مربوط ہیں جبکہ درمیان کا شعبہ اصلاً تو انسان کا انفرادی اور باطن کا کام ہے لیکن عملی مظاہرہ اجتماعی زندگی میں ہوتا ہے۔ پھر اس آخری شعبے یعنی معاملات کی پانچ صورتیں ہیں: [1]

۱: باہمی لین دین اور اس سے متعلقہ امور: ان کو "مالی معاوضات" کہا جاتا ہے، اس کے تحت خرید و فروخت، کرایہ داری، شراکت اور ان جیسے ابواب داخل ہیں۔

۲: شادی بیاہ کے معاملات: ان کو "مناکحات" سے تعبیر کیا جاتا ہے، اور اس کے تحت نکاح و طلاق، نان و نفقہ اور اس سے وابستہ مسائل داخل ہو جاتے ہیں۔

۳: آپس کے تنازعات اور جھگڑیں: ان کو "مخاصمات" کہتے ہیں۔ یہ باب دعویٰ، شہادت اور قضاء و جرگہ اور اس نوعیت کے تمام مسائل پر مشتمل ہوتا ہے۔

---

[1] اجمالی طور پر یہ ترتیب فقہ کی مشہور کتاب "البحر الرائق" سے لی گئی ہے، ملاحظہ فرمائیں: البحر الرائق، کتاب الطہارۃ، ج۱ص۷۔

۴: چوتھے شعبہ کو "امانات" کا نام دیا جاتا ہے، اور اس کے تحت ودیعت (کسی کے پاس کوئی امانت رکھوانا) عاریت (وقتی طور پر استعمال کے لئے کسی سے کوئی چیز لینا) صدقہ وہدیہ ، وقف اور اجتماعی املاک وغیرہ کے مسائل داخل ہیں۔

۵: اس شعبہ کو "ترکات" سے موسوم کیا جاتا ہے جس میں میراث ووصیت اور اس سے جڑے ہوئے مسائل واحکام شامل ہیں۔

چونکہ ان پانچوں قسم کے مسائل میں دو یا زیادہ افراد کا آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ واسطہ پڑتا ہے، اس لئے ان کو "معاملات" کہا جاتا ہے۔

پہلا شعبہ: عقائد ونظریات

"عقائد" عقیدہ کا جمع ہے اور عقیدہ کا لفظ "عقد" سے نکلا ہے جس کا معنٰی ہے: کسی چیز کو گرہ لگانا۔ اصطلاحی زبان میں عقیدہ سے مراد "وہ یقین کامل ہوتا ہے جس میں شک وتردد کی نوبت نہیں آتی" یا "وہ پختہ اور ناقابل تردید خیال جس میں شک وشبہ کی گنجائش نہ رہے۔" دین اسلام میں بنیادی طور پر عقائد کی دو قسمیں ہیں:

الف: پہلی قسم ان عقائد کی ہے جن کے اعتقاد رکھنے کا قرآن وحدیث میں حکم دیا گیا ہے مثال کے طور پر اللہ تعالٰی کے وجود اور اس کی وحدانیت وغیرہ صفات پر ایمان لانا، حضرات انبیاء کرام علیہم الصلاۃ والسلام اور ان کی بعثت ورسالت کی تصدیق کرنا۔ آخرت کے ہونے کا یقین رکھنا وغیرہ۔

ب: دوسری قسم میں وہ امور داخل ہیں جن کے اعتقاد رکھنے کا کوئی صریح تو شریعت کے دلائل میں نہیں دیا گیا ہو لیکن نصوص میں ان کو اخبار کے طور پر ذکر کیا گیا ہو اور وہ

نصوص کی صراحت یا اشارات سے مستنبط ہوں۔ مثال کے طور پر فرعون نامی ایک حکمران کا موجود ہونا، سات آسمانوں اور سات زمینوں کا موجود ہونا، آسمان کا اوپر ہونا۔

ان دونوں قسم کی باتوں پر نصوص کے منشا کے مطابق ایمان واعتقاد رکھنا لازم ہے۔ اس کو سہولت کے ساتھ یوں بھی تعبیر کیا جاسکتا ہے کہ نصوص میں جن چیزوں کے موجود یا معدوم ہونے کی خبر دی گئی ہے، چاہے وہ صراحت کے ساتھ ہو اور مقصود کے درجہ میں ہو یا اشارہ کے ساتھ اس کی خبر دی گئی ہو، اس پر نص کی رہنمائی کے مطابق ایمان واعتقاد رکھنا ضروری ہے، چاہے وہاں صراحت کے ساتھ اعتقاد رکھنے کا حکم دیا گیا ہو یا نہیں۔

اب دین اسلام کے اس شعبے میں بہت سی ایسی چیزیں ہیں جن کا یقین وعقیدہ رکھنا ضروری ہے اور "علم کلام" ایک مستقل دینی علم وفن ہے جہاں اس قسم کی باتوں کو تفصیل کے ساتھ مدلل ذکر کیا جاتا ہے، اس لئے تفصیلی عقائد جاننے کے لئے اسی فن کی معتبر کتابوں کی طرف مراجعت کرنے کی ضرورت ہے۔ تاہم موٹی موٹی باتیں چھ ہیں اور اکثر عقائد کا تعلق انہی چھ چیزوں کے ساتھ ہوتا ہے، ان کو "اصول دین" بھی کہا جاتا ہے۔ وہ چھ باتیں یہ ہیں:

اللہ پر ایمان

۱: اللہ تعالیٰ کے وجود اور اس کی وحدانیت وغیرہ صفات پر ایمان لانا۔ دل میں یہ یقین رکھنا کہ اللہ تعالیٰ موجود ہے، وہی ہستی اس کائنات کا خالق، مالک ہے اور وہی اس نظام عالم کو چلا رہا ہے، وہ کسی کا بالکل محتاج نہیں ہے اور اس کے سوا جتنی چیزیں یا لوگ ہیں وہ سب کے سب اسی نے تخلیق فرمائے ہیں جو ہر آن اور ہر لحہ اس کے محتاج ہیں۔ وہ اپنی ذات وصفات کے لحاظ سے مخلوق کے مشابہ نہیں ہے اس لئے جسمیت اور اس کے تمام تر لوازم

سے وہ بالکل پاک اور بالاتر ہے، اسی طرح ہر نقص وعیب کی بات سے وہ بالکل پاک ہے۔ عبادت اور بندگی کرنا اسی کا حق ہے اور محض اسی ہستی کے ساتھ یہ بات جچتی ہے کہ لوگ اس کی عبادت کریں اور اس کے سامنے سر نیاز جھکائے۔ وہ سب کچھ دیکھتا، سنتا اور جانتا ہے، کائنات میں جو کچھ ہوتا ہے، اس کے ارادے اور مشیت سے ہوتا ہے، اس کے ارادے کے بغیر کچھ واقع نہیں ہوسکتا، البتہ اس کی خوشنودی اور رضامندی صرف نیک کاموں کے ساتھ متعلق ہے، کفر و معاصی کو وہ بالکل پسند نہیں فرماتے۔

فرشتوں پر ایمان

فرشتے اللہ تعالیٰ کی ایک خاص نورانی مخلوق ہے، ان کے متعلق اس بات پر یقین رکھنا ضروری ہے کہ اس مخلوق کو اللہ تعالیٰ نے پیدا فرمایا ہے، یہ گو عام طور پر انسانی نگاہوں سے اوجھل ہوتے ہیں لیکن کسی چیز کے موجود ہونے کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ اس کا مشاہدہ کیا جائے اور قرآن وحدیث کے سینکڑوں نصوص میں اس کی خبر دی گئی ہے، اس لئے ان کے متعلق صحیح نصوص میں جتنی باتیں بتائی گئیں ہیں، ان سب پر ایمان لانا ضروری ہے۔

اللہ تعالیٰ کتابوں پر ایمان

اللہ تعالیٰ نے اپنے برگزیدہ پیامبروں (علیہم الصلاۃ والسلام) پر مختلف کتابیں اور متعدد صحائف نازل فرمائے ہیں۔ کتابیں چار ہیں: جن میں قرآن کریم ہمارے پیارے رسول حضرت محمد ﷺ پر نازل فرمائی گئی، تورات حضرت سیدنا موسیٰ علیہ الصلاۃ والسلام پر، انجیل حضرت سیدنا عیسیٰ علیہ الصلاۃ والسلام پر جبکہ زبور حضرت داؤد علیہ الصلاۃ والسلام پر نازل فرمائی گئی۔ اور صحائف میں سے کچھ حضرت سیدنا ابراہیم علیہ الصلاۃ والسلام پر نازل

فرمائے اور کچھ حضرت سیدنا موسیٰ علیہ الصلاۃ والسلام پر اور کچھ دیگر حضرات انبیاء کرام علیہم الصلاۃ والسلام پر۔ ان سب کتابوں اور صحائف پر اجمالی طور پر یہ ایمان لانا لازم ہے کہ یہ سب اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل کردہ ہیں، سب قابل تعظیم اور لائق احترام ہیں، اور جس زمانے کے لئے جو کتاب نازل فرمائی گئی، اس دورانیہ میں اس کتاب یا صحیفہ پر عمل کرنا اور اس میں دیئے ہوئے باتوں کی پاسداری و تابعداری کرنا ضروری تھا، البتہ دیگر کتابوں کی ابدی حفاظت کا وعدہ چونکہ اللہ تعالیٰ نے کیا تھا، اس لئے مختلف خیانت کرنے والے گناہ گار لوگوں نے ان میں طرح طرح کی تحریف کرڈالی اور وحی کے ساتھ اپنی پسند کی باتوں کو بھی شامل کردیا جس کی وجہ سے حق اور باطل کی تمیز کرنی مشکل ہوئی، اور یہ یقین کرنا ممکن نہ ہوا کہ ان میں سے کونسی بات واقعۃ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل کردہ ہے اور کونسی بات لوگوں کی اپنی بنائی ہوئی ہے۔ جہاں تک قرآن کریم کی بات ہے تو اس کی ابدی حفاظت کا اللہ تعالیٰ نے وعدہ لے رکھا تھا، اس لئے یہ ہر دور میں محفوظ رہا اور آج بھی ہمارے پاس وہی قرآن ہے جو حضور نبی کریم ﷺ پر نازل ہوا تھا، اس میں کسی شک وشبہ کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

اللہ تعالیٰ کے رسولوں پر ایمان

انسانوں میں سے بعض برگزیدہ بندوں کو اللہ تعالیٰ نے منتخب کیا اور اپنا پیغام دے کر عام انسانوں کی طرف مبعوث فرمایا، ان کو انبیاء کرام کہا جاتا ہے۔ نبوت انسانی شرافت و ترقی کا سب سے بلند تر درجہ ہے، یہ منصب کوئی کسب و کمائی کی چیز نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ براہ راست اپنے کچھ برگزیدہ بندوں کا اس کے لئے انتخاب فرماتے ہیں اور ان کو اپنا رسول بنا کر لوگوں کی طرف بھیجتا ہے۔ نبوت کی تصدیق معجزات دکھانے سے ہوتی ہے، جب

کوئی مدعی نبوت معجزہ دکھاتا ہے تو اس پر ایمان لانا ضروری ہوتا ہے اور اسی سے اس کے نبی ہونے کا علم حاصل ہو جاتا ہے۔ نصوص میں تمام انبیاء کرام علیہم الصلاۃ والسلام کے اسماء گرامی اور ان کی تفصیل موجود نہیں ہے تو لہذا اس قدر اجمالی ایمان لانا کافی ہے کہ جس شخصیت کو بھی اللہ تعالیٰ نے نبوت ورسالت کے اس شرف وعزت سے نوازا ہے، ہم ان پر ایمان لاتے ہیں، ان کو خدا کا رسول تسلیم کرتے ہیں اور وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو کچھ پیغام لائے ہیں، اس کو درست اور حق تسلیم کرتے ہیں۔ کسی دلیل کا سہارا لئے بغیر کسی کو نبی کہنا اللہ تعالیٰ پر افتراء کرنے کے مترادف ہے جو خطرناک گناہ اور بھیانک جرم ہے، اسی طرح کسی ہستی کی ثابت شدہ نبوت کا انکار کرنا بھی کفر ہے۔ ہمارے حضور ﷺ خاتم النبیین ہے، آپ ﷺ پر نبوت کا دروازہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بند کر دیا گیا ہے، چنانچہ آپ ﷺ کے بعد کسی شخص کو نئی نبوت نہیں ملے گی۔ اگر کوئی اس کا دعویٰ کرتا ہے تو بلا شبہ وہ جھوٹا مجرم ہے اور کافر بھی۔

تقدیر پر ایمان

اس کائنات میں جو کچھ ہوتا ہے، وہ اللہ تعالیٰ کے علم وارادے کے تحت ہی ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ کا علم سب چیزوں کو محیط ہے، یوں ہی ہر ممکن چیز اس کی قدرت کے تحت داخل ہے۔ اللہ تعالیٰ کو پہلے سے معلوم تھا کہ کائنات میں کیا ہو گا اور کون کس وقت کیا کرے گا؟ یہ ساری باتیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے لوح محفوظ میں لکھی گئی ہے۔ ابھی تک جو کچھ ہوا ہے، ہو رہا ہے یا آئندہ جو کچھ ہو گا، یہ ساری کی ساری باتیں ایسی ہیں جو لوح محفوظ میں لکھی گئی ہیں، اس کے خلاف کچھ ہوا ہے اور نہ ہو گا۔ البتہ تقدیر کی وجہ سے کوئی انسان مجبور محض نہیں بن جاتا ہے کہ اس کا مطلق کوئی اختیار ہی نہ رہے کہ وہ بالکل جماد محض بن

جائے بلکہ ایک حد تک اس کو اختیار دیا گیا ہے اور اسی اختیار کی بنیاد پر وہ اچھے و بھلے کام انجام دیتا ہے یا برے اور مذموم کاموں کی طرف جاتا ہے اور اسی اختیار کی بنیاد پر "مجازات" یعنی سزا اور جزاء کا سلسلہ قائم ہو گا۔

روزِ آخرت پر ایمان

یہ موجودہ نظام کائنات ہمیشہ سے ہے نہ ہمیشہ تک رہے گا، بلکہ ایک دن اس نے ضرور ختم ہونا ہے، اسی طرح انسان کو یہاں کھیل تماشے کے لئے نہیں بھیجا گیا کہ جو چاہے کرے، بلکہ ایک با مقصد زندگی گزارنے کے لئے پیدا کیا گیا کہ یہاں آ کر وہ اللہ تعالیٰ کی عبادت و بندگی کرتا رہے، اب کچھ لوگ اس مقصد کا خیال و لحاظ رکھتے ہیں اور اسی کے مطابق زندگی گزارتے ہیں اور بعض لوگ اس کا بالکل پاس نہیں رکھتے، ان دونوں قسم کے لوگوں کے جزاء و سزا کے لئے ایک دن مقرر ہے۔ چنانچہ ایک دن ہر متنفس کو موت دیدی جائے گی اور کائنات کا یہ نقشہ ختم کر دیا جائے گا اور بس ایک اللہ تعالیٰ ہی رہے گا۔ اس کے بعد تمام انسانیت کو نئے سرے سے اٹھایا جائے گا اور حساب و کتاب کا میدان قائم ہو گا، جہاں لوگوں کے اعمال تولے جائیں گے، ان کے اعمال کا حساب ہو گا اور پھر جنت و جہنم کے فیصلے ہوں گے۔ نیکو کار لوگ جنت میں جائیں گے جبکہ بدکار لوگ جہنم میں بھیجے جائیں گے، پھر ان میں سے جو لوگ کافر تھے وہ تو ہمیشہ ہمیشہ وہی رہیں گے، اور جو مسلمان تھے لیکن اپنی گناہوں کی کثرت کی وجہ سے جہنم گئے، ان کو ایک دن وہاں سے نکال کر جنت میں داخل کر دیا جائے گا۔

دوسرا شعبہ: عبادات

اسلام کی نظر میں عبادت تعمیل حکم اور امتثال امر سے عبارت ہے، اس طرح پوری شریعت اس میں داخل ہو گئی کیونکہ جب اسلامی شریعت پوری انسانی زندگی کے تمام تر احوال واطوار کو محیط ہے تو اس کے مطابق عبادت کی تصور بھی کسی خاص شکل، جگہ یا وقت کے ساتھ خاص نہیں ہے بلکہ کسی بھی وقت اللہ تعالیٰ کا حکم بجالانا عبادت کہلائے گا۔ البتہ شعبوں کی اس تقسیم میں "عبادات" سے مراد شریعت کے وہ احکام ہیں جن میں عبادت ہی کا پہلو غالب رہتا ہے اور مزید کوئی مادی نفع اس میں مقصود نہ ہو۔

اس معنی میں سرفہرست عبادات چار ہیں: ۱: نماز۔ ۲: زکوۃ۔ ۳: روزہ۔ ۴: حج۔ ان میں سے ہر عبادت کے لئے کچھ باتیں ایسی ہیں جن کے بغیر شرعاً اس عبادت کا بالکل کوئی اعتبار نہیں ہوتا ہے، ان کو "ارکان وشرائط" کہا جاتا ہے، پھر شرائط کی بھی مختلف نوعیتیں ہیں۔ اسی طرح بعض باتیں ایسی ہیں جن کے بغیر عبادت کا اعتبار تو ہوتا ہے اور انسان کا ذمہ بھی اس سے فارغ ہو جاتا ہے تاہم اگر ان باتوں کو بھی ساتھ بجالایا جائے تو عبادات کے ثواب میں زیادتی کا سبب بن جاتی ہیں، ان باتوں کو "سنن اور مستحبات" سے تعبیر کیا جاتا ہے، پھر اس کے بھی مختلف درجے ہیں۔ اس کے علاوہ بھی ہر عبادت کے ساتھ مختلف مباحث ومسائل مربوط ہوتے ہیں۔ ان تمام مسائل کی تفصیل کے لئے "علم فقہ" کی کتابوں کی طرف مراجعت ضروری ہے، جہاں ان جیسے درپیش تمام مسائل کے حل ذکر ہوتے ہیں۔

لیکن فقہی حیثیت کے علاوہ ان عبادات کی اور حیثیت بھی ہے، وہ یہ ہے کہ ان عبادات میں کیا مقاصد وفوائد مضمر ہیں؟ ان عبادات کے انجام دینے پر کیا اچھے اثرات اور

بھلے ثمرات مرتب ہوتے ہیں؟ اسی طرح اس میں کوتاہی برتنے کی صورت میں کن مفاسد کا خطرہ مول لینا پڑتا ہے؟ نیز دین اسلام کی ان عبادات اور دیگر ادیان کی عبادات میں کیا فرق ہے؟ دونوں قسم کی عبادات کا مقارنہ اور تجزیہ وغیرہ۔ ان جیسی مباحث کے لئے حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی رحمہ اللہ کی اردو کتاب "ارکان اربعہ" کا مطالعہ بہت مفید ہے۔

شعبہ: معاملات

معاملات سے مراد وہ صورتیں ہیں جہاں ایک سے زیادہ افراد کا آپس میں ربط وتعلق پیدا ہوتا ہے اور جیسا کہ پہلے ذکر کیا گیا تھا معاملات کی پانچ بنیادی صورتیں ہیں اور ان میں سے ہر ہر صورت سے متعلق دین اسلام نے کچھ تعلیمات وہدایات دیئے ہے، ان تمام احکام وہدایات کی تفصیل علم فقہ اور علم حدیث کی کتابوں میں درج ہے۔

شعبہ: معاشرت

انسانوں کا باہمی رہن سہن، برتاؤ اور اس سے وابستہ تعلیمات وہدایات بھی دین اسلام کا ایک اہم تر شعبہ ہے، دیگر تمام شعبوں کی طرح اس شعبہ کی تعلیمات وہدایات بھی کچھ کم نہیں ہیں۔ البتہ دین اسلام نے اس باب میں عام طور پر اصولی احکام دئے ہیں اور ان کی جزوی صورتوں کو ضروری قرار نہیں دیا جس کی ایک بڑی حکمت یہی ہے کہ معاشرے میں ارتقاء کا سفر برابر جاری رہتا ہے اور کسی خاص وقت یا ماحول میں جو رسم وصورت جاری ہوتی ہے، ضروری نہیں ہے کہ دنیا جہاں کے تمام لوگ اور قیامت تک آنے والی تمام انسانیت کے لئے وہ مفید بلکہ آسان وممکن ہو۔

معاشرے میں انسانوں کے مختلف طبقات بستے ہیں اور ان کے ساتھ ربط و تعلق کی مختلف صورتیں پیش آتی رہتی ہیں، دین اسلام نے ان مختلف طبقات کے مختلف حقوق و فرائض مقرر فرمائیں، انہی کے مجموعے کا نام "اسلام کی معاشرتی تعلیمات" ہے۔ چنانچہ معاشرے میں جو لوگ رہتے ہیں ان میں پہلا طبقہ انسانیت کا ہے، پھر انسانیت کی لڑی میں جو لوگ جڑتے ہیں ان میں سے بعض مسلمان ہیں اور بعض غیر مسلم۔ اسی طرح بعض لوگ پڑوسی ہوتے ہیں اور انسان کے قرب وجوار میں رہتے ہیں اور بعض دور۔ بعض کے ساتھ کوئی خاص رشتہ داری ہوتی ہے جبکہ بعض کے ساتھ انسانیت، اسلام یا پڑوس کے علاوہ کوئی خاص رشتہ نہیں ہوتا۔ بعض کم سن بچے ہوتے ہیں اور بعض بوڑھے۔ بعض کمزور ولاچار ہوتے ہیں جو اپنی بنیادی ضروریات کے حاصل کرنے سے بھی عاجز ہوتے ہیں مثال کے طور پر مفلوج، کسی خطرناک مرض کے شکار لوگ، نابینا، لنگڑا وغیرہ۔ دینی رہنمائی کا فریضہ انجام دینے والے بھی اسی معاشرے میں رہتے ہیں اور صنف نازک یعنی عورت بھی اسی معاشرے کا حصہ ہے۔

شریعت اسلامیہ میں ان تمام مختلف طبقات کے متعدد حقوق و فرائض متعین فرمائے گئے ہیں اور پھر ان متعین کردہ حقوق کا مرتبہ بھی یکساں نہیں ہیں بلکہ بعض کو ضروری کے درجہ میں رکھا جس کی خلاف ورزی کرنا دینی جرم اور گناہ ہے، اور بعض کو مسنون اور مستحب کے درجہ میں رکھا جس کا کرنا موجب ثواب اور قابل تعریف ہے لیکن نہ کرنا باعث گناہ نہیں ہے۔

پھر جو حقوق متعین کئے ہیں، ان میں سے ایک قسم تو ان حقوق کی ہے جو مالی حقوق کہلاتے ہیں مثلا: والدین، بیوی بچوں اور دیگر اقرباء کو نان ونفقہ اور ضروریات زندگی

فراہم کرنے کا حق۔ اور بہت سے حقوق ایسے ہے جن کا تعلق مال کے ساتھ تو نہیں ہوتا اور ان کی ادائیگی کے لئے مال دینا ضروری نہیں ہوتا بلکہ یوں ہی دوسرے افراد کو سکون وراحت پہنچانے کے لئے مقرر کئے ہیں اور یہ ہر مسلمان بلکہ انسان کا حق متعین کر دیا گیا ہے کہ بلاوجہ اس کو کسی قسم کی ذہنی، مالی یا جسمانی اذیت وتکلیف نہ دی جائے، اس کو بلاوجہ تکلیف وپریشانی پہنچانے سے محفوظ رکھا جائے۔ حضور نبی اکرم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

عن أبي موسى رضي الله عنه، قال: قالوا يا رسول الله، أي الإسلام أفضل؟ قال: «من سلم المسلمون من لسانه، ويده»[1]

ترجمہ: "ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول ﷺ سے پوچھا گیا کہ: کونسا اسلام بہتر ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: جس کے زبان اور ہاتھ سے دوسرے مسلمان محفوظ رہیں"۔

یہ تو انسانیت اور اس کے مختلف طبقات کے حقوق کا حال ہے۔ دین اسلام نے صرف انسان ہی کو حقوق نہیں بخشے بلکہ حیوانات کے بھی حقوق مقرر فرمائے ہیں چنانچہ بلا ضرورت کسی جانور کو مارنے، قتل کرنے یا یوں ہی اس کو اذیت پہنچانے کو ممنوع ومذموم قرار دیا اور اس کی بہت سی صورتوں کو گناہ شمار کر کے ایک قابل مؤاخذہ جرم قرار دیا گیا۔

---

[1] صحيح البخاري، كتاب الإيمان، باب: أي الإسلام أفضل؟ ج ١ ص ١٢.

شعبہ: اخلاق

"اخلاق" خلق کی جمع ہے اور خلق سے مراد انسان کا وہ راسخ ملکہ اور مستحکم قوت ہے جس سے سہولت کے ساتھ متعلقہ کام صادر ہوتے ہیں۔ شریعت اسلامیہ اس باب میں بھی اعتدال و توازن کا سبق دیتی ہے اور اپنے پیروکاروں کو یہ تعلیم دیتی ہے کہ وہ اخلاق حسنہ اختیار کریں۔

مثال کے طور پر زید کی کوئی حق تلفی ہوئی اور جس نے حق تلفی کی ہے وہ ہر لحاظ سے زید کی بنسبت کمزور ہے، اب اس پر غصہ آنا انسانی سرشت کا مسئلہ اور اس کا تقاضا ہے جو بذات خود مذموم نہیں ہے، لیکن اگر کبھی کبھار زید ایسے موقع پر اپنے آپ کو تھامے رکھے اور یا تو بالکل ہی انتقام نہ لے، یا بدلہ لینے کی صورت میں اپنے واقعی حد سے آگے نہ گزرے تو یہ گو ایک اچھا اور مستحسن اقدام ہے، لیکن کبھی کبھار ایسا کرنے کو اخلاق نہیں کہتے۔ یوں ہی خالد کے پاس مال و دولت کے خزانے ہیں اور کبھی جوش میں آکر اس میں سے کچھ خرچ کیا تو یہ گو صدقہ ہے جو اگر اچھی نیت کے ساتھ ہو تو ضرور نیکی اور ثواب کی بات ہے لیکن اس طرح اتفاقی طور پر دینے کو اخلاق سے تعبیر نہیں کیا جاتا۔

ان باتوں کو اسی وقت اخلاق حسنہ کہہ سکتے ہیں جب یہ چیزیں انسان کے قابو و قدرت میں آجائیں اور وہ محض اتفاقی طور پر یا کبھی کبھار نہیں بلکہ ہر ایسے موقع پر اپنے جذبات کو حدود کے اندر رکھے اور شریعت کے دائرے سے کہیں باہر قدم نہ رکھے، مثال کے طور پر صبر و حلم کا خلق انسان میں تب تسلیم کیا جاسکتا ہے جبکہ ہر ناہموار حالت میں اپنے نفس کو قابو میں رکھنے کی طاقت میسر ہو، یوں ہی جود و سخا کا خلق تبھی کسی کے اندر متحقق ہو سکتا ہے جبکہ ہر موقع پر اس میں خرچ کرنے کی صلاحیت و استعداد پیدا ہو جائے۔

وقتی اور ظاہری طور پر خوش اخلاقی کا مظاہرہ کرنا، نرم خوئی اور اچھا برتاؤ سے پیش آنا کوئی مشکل کام نہیں ہے جس کو آج کل تجارتی اخلاق سے تعبیر کیا جاتا ہے اور شومی قسمت ہے کہ آج کل اسی کو اچھے اخلاق سمجھا جاتا ہے۔ لیکن شریعت اپنے پیروکاروں کو 7
ان جیسے ابتدائی مرحلوں میں نہیں چھوڑتی بلکہ ہاتھ پکڑ کر اصل اخلاق کے کمال تک لے پہنچاتی ہے، اور اس مقام پر اس کو لے جاکر کھڑا کرتی ہے جہاں یہ اچھے اخلاق اور بھلے صفات صرف وقتی نہ رہے بلکہ دائمی بن جائے اور محض ظاہری زبان وچہرے تک محدود نہ رہے بلکہ دل کی گہرائیوں میں جاکر اچھائی پیوست ہوجائیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کا تصور اخلاق اور تعلیم اخلاق کس قدر حقیقت پسندی اور پائیداری پر مشتمل ہے۔

اخلاق حسنہ اور سیئہ کی تفصیل

دین اسلام جن اچھے اخلاق کا حکم دیتا ہے، ان میں سرفہرست یہ ہیں:

۱: صبر۔ ۲: شکر۔ ۳: خوف ورجاء۔ ۴: زہد۔ ۵: اللہ ہی پر توکل اور بھروسہ۔ ۶: اللہ تعالیٰ کی محبت وشوق۔ ۷: ہر کام میں نیت کی درستگی اور اخلاص وللّٰہیت۔ ۸: فکر ومحاسبہ۔

جن برے اخلاق کی یہ دین حق مذمت کرتا ہے اور اپنے ماننے والوں کو ان سے دور رکھنا چاہتا ہے، ان میں نمایاں یہ ہیں:

۱: غیظ وغضب۔ ۲: بغض وحسد۔ ۳: دنیا سے محبت۔ ۴: مال کی محبت۔ ۵: جاہ وجلال اور عزت ودبدبے کی محبت۔ ۶: خود پسندی اور تکبر۔

ان اخلاق میں جائز وناجائز کے درجات کیا ہوں گے؟ اور جو جائز اور اچھے اخلاق ہیں، ان میں واجب اور مستحب ہونے کے مراتب کیا ہوں گے؟ اسی طرح مذموم اخلاق میں حرام یا مکروہ ہونے کی تفصیل کیا ہوگی؟ یہ اور اس سے ملی جلی تمام تفصیلات "علم تصوف

وسلوک" کی کتابوں میں ذکر کی جاتی ہے۔ عربی زبان میں اس کے لئے امام غزالی رحمہ اللہ کی کتابوں کی طرف مراجعت کرنا بہت مفید ہے، اور اردو زبان میں اس ناکارہ کی کتاب "علم تصوف وسلوک" میں ان باتوں کو ذکر کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

دین اسلام کی خصوصیات وامتیازات

اسلام ہی کیوں؟

غور کیا جائے تو انسانی زندگی انقلاب وتغیر کا ایک مربوط تسلسل معلوم ہوتی ہے، ہر دور میں انسانی معاشرے کے مختلف اطراف واکناف میں اس کے زمزمے سنائی دیتی ہیں اور کسی نہ کسی شکل میں چھوٹی بڑی تحریکیں اٹھتی محسوس ہوتی ہیں اور مذہب بھی چونکہ انسان کی ایک اہم اور بنیادی ضرورت ہے، اس لئے اس کے متعلق بھی انسان کا مزاج تغیر پسند اور انقلاب آمیز دکھائی دیتا ہے، یہی وجہ ہے کہ ماہرین کے خیال کے مطابق اس وقت دنیا میں ہزاروں ادیان موجود ہیں اور پھر ہر دین کے پیروکاروں نے اس میں طرح طرح کی تبدیلیاں کر رکھی ہیں۔ اس لئے ادیان ومذاہب کے اس ازدحام میں بجا طور پر یہ سوال اٹھایا جاسکتا ہے کہ ان تمام ادیان کے مقابلہ میں خاص دین اسلام ہی کو کیوں اختیار کیا جائے؟ اس دین میں کونسی ایسی امتیازی خصوصیت یا وصف ہے جس کی بنیاد پر اس کو دیگر ادیان پر ترجیح دی جائے اور اس کی بنیاد پر اس اصرار کرنے کا کوئی جواز فراہم ہو جائے کہ دین اسلام ہی دین انسانیت ہے؟ یہاں انہی امتیازی خصوصیات واوصاف کو اجاگر کرنا مقصود ہے۔

اسلام کی بعض خصوصیات

یوں تو دین اسلام میں بہت سی ایسی خصوصیات ہیں جو اس کے گلے کے ہار ہیں اور دیگر ادیان و ملل کو وہ نصیب نہیں ہیں لیکن یہاں چند بنیادی خصوصیات کو ذکر کیا جاتا ہے۔

پہلی خصوصیت: کاملیت

اسلام دین کامل ہے اور دین کامل کا معنیٰ پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ اس میں انسانی زندگی کے تمام تر گوشوں کے متعلق احکام وہدایات ذکر کئے گئے ہیں، انسانی زندگی کا کوئی ایسا مشغلہ نہیں ہے جس میں یہ دین اسلام اس کی رہبری کرنے سے عاجز یا غافل ہو۔ اس کے علاوہ جو ادیان ومذاہب رائج ہیں، ان میں کوئی دین ومذہب ایسا نہیں ہے جو اس طرح کامل ہو، اور قدم بہ قدم پر انسان کی رہنمائی کرتا رہے، ادیان میں سے کوئی دین صرف روحانیات اور اخلاقیات پر توجہ مرکوز رکھتا ہے تو کوئی صرف چند رسوم وعبادات کو اپنا دائرہ کار بناتا ہے، اسی طرح عصر حاضر میں جو مختلف نظامہائے زندگی میدان میں لائے گئے ہیں جن کے لئے براہ راست دین ومذہب کا نام وعنوان تو استعمال نہیں ہوتا لیکن جو کام دین کا ہے وہی ان سے بھی لیا جاتا ہے، ان تمام نظاموں کا بھی یہ حال ہے کہ وہ انسانی زندگی کے تمام تر اشغال ومصروفیات کا احاطہ کرنے سے قاصر ہے۔

دین اسلام کے کامل ہونے کی دلیل کیا ہے؟ اور اس کو اس دین کی خصوصیت کیوں قرار دی گئی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اس کی بنیادی طور پر دو دلیلیں ہیں؛

پہلی دلیل خود اس دین کا دعویٰ ہے کہ وہ کامل ومکمل ہے، اور قیامت تک کے لئے اس میں مزید کسی کھود وکرید کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ چنانچہ قرآن کریم میں ہے:

﴿الْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَأَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي وَرَضِيتُ لَكُمُ الْإِسْلَامَ دِينًا﴾[1]

ترجمہ: "آج میں تمہارے لیے تمہارا دین پورا کر چکا اور میں نے تم پر اپنا احسان پورا کر دیا اور میں نے تمہارے واسطے اسلام ہی کو بطور دین پسند کیا ہے"۔

اس پر تمام مسلمان اہل علم کا اجماع واتفاق ہے کہ دین اسلام مکمل ضابطہ حیات ہے جس میں انسانی زندگی کے تمام نشیب و فراز کے متعلق کچھ جامع احکام دیے گئے ہیں اور حضور ﷺ کی رحلت کے بعد اس میں مزید کسی کمی زیادتی کا نہ موقع ہے اور نہ ضرورت۔

علامہ ابن حزم لکھتے ہیں:

وَاتَّفَقُوا أَنه مذ مَاتَ النَّبِي صلى الله عَلَيْهِ وَسلم فقد انْقَطع الْوَحْي وكمل الدّين وَاسْتقر وَأَنه لَا يحل لأحد أَن يزِيد شَيْئا من رَايه بِغَيْر اسْتِدْلَال مِنْهُ وَلَا أَن ينقص مِنْهُ شَيْئا وَلَا أَن يُبدل شَيْئا مَكَان شَيْء وَلَا أَن يحدث شَرِيعَة وَأَن من فعل ذَلِك كَافِر[2]

ترجمہ: "تمام امت کا اس بات پر اتفاق ہے کہ جب سے رسول اللہ ﷺ نے رحلت فرمائی ہے تو وحی کا سلسلہ ختم ہو کر دین مکمل ہو چکا ہے، کسی کو بھی یہ حق نہیں کہ شرعی دلیل کے بغیر اس دین میں اپنی رائے سے اضافہ کرے، یا کمی

---

[1] المائدة: آية ۳.

[2] مراتب الإجماع، ص: ۱۷۴

کرے، یا کسی قسم تبدیلی کرے، نہ کسی کو نیا دین ایجاد کرنے کا حق ہے۔ اگر خدانخواستہ کوئی اس کا ارتکاب کرے، تو وہ کافر ہے"۔

دوسری دلیل خود اس دین کی تعلیمات ہے کہ اس نے اپنے پیروکاروں کو جو تعلیمات وہدایات دے رکھی ہے وہ کسی خاص دائرے کی حد تک محدود نہیں ہے بلکہ انسانی زندگی کے تمام تر پہلوؤں کو محیط ہے جس کا کچھ اجمالی تعارف پہلے "دین کے شعبوں" کے عنوان کے تحت ذکر کیا گیا ہے۔ دین اسلام کی بنیاد قرآن وحدیث پر ہے، اگر ان دونوں مصادر کا انصاف اور سمجھنے کی نیت سے مطالعہ کیا جائے تو واضح ہو جاتا ہے کہ اس میں صرف عقائد ونظریات، عبادات ومعاملات ہی کے احکام مذکور نہیں ہیں، بلکہ انسانیت کے ہر موجود یا ممکن پہلو کے متعلق ہدایات دیے گئے ہیں، اور انسانی زندگی کا کوئی پہلو ان تعلیمات سے باہر نہیں ہو سکتا۔ قرآن وحدیث کا نچوڑ علم فقہ ہے، اگر اس کی مطول کتابوں کا مطالعہ کیا جائے تو ابواب بندی کی شکل میں بڑے سہولت کے ساتھ اس بات کی واضح تصدیق کی جاسکتی ہے۔

جہاں تک دوسرا سوال ہے یعنی یہ کہ یہ تمام وکمال ہونا صرف دین اسلام ہی کی خصوصیت کیوں ہے؟ تو اس کا جواب واضح ہے کہ دیگر ادیان کی معتبر کتابیں خود اس بات کا دعویٰ نہیں کرتیں کہ وہ کامل ہے اور اپنے پیروکاروں کے ہر ہر قدم اور زندگی بھر کے تمام تر نشیب وفراز میں رہنمائی کرنے کے ذمہ دار اور کفیل ہیں۔ اور ساتھ ان کی کتابیں عملی طور پر بھی تمام اشغال کے متعلق تمام احکام وہدیات کا احاطہ نہیں کرتیں۔

اسلام کی صفت کاملیت اور ہمارا برتاؤ

دین اسلام کی یہ صفت کاملیت ایک ایسی صفت ہے جو اپنے ساتھ مزید کسی دین ومذہب کے لئے کوئی گنجائش نہیں چھوڑتی۔ یہی وجہ ہے کہ یہ صفت بہت سے اسلام بے زار طاقتوں کو نہیں بھاتی اور وہ ہر طرح اس کو مسخ کرنے یا کم از کم لوگوں کے ذہن میں اس کی اہمیت گھٹانے کے درپے ہوتے ہیں۔ اب صاف سیدھا انکار کرنا تو زیادہ کارگر اس لئے ثابت نہیں ہوتا کہ قرآن کریم نے پوری وضاحت کے ساتھ اس کا ذکر کیا ہے، اس لئے دیگر راستوں سے آکر اس نظریہ کو کمزور کرنے کی کوششیں کی جاتی ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ کا بہت ہی فضل وکرم اور بے پایاں شکر واحسان ہے کہ ہماری ہر طرح غفلت اور بے توجہی کے باوجود اس نے ان جیسے حملوں کو کامیاب ہونے نہیں دیا اور دین اسلام کی یہ خصوصیت اور اس کا اعتقاد وتصور مکمل طور پر امت کے ذہن وتصور سے غائب نہیں ہوا۔

تاہم اس بات سے بھی انکار کرنے کی گنجائش نہیں ہے کہ بڑی حد تک وہ اپنے اس مشن میں کامیاب ہو چکے ہیں جس کے بہت سے مظاہر میں سے ایک بڑا مظہر یہ بھی ہے کہ ہمارے ہاں دین داری اور بے دینی کا معیار، اچھائی وبرائی کا مدار محدود سے محدود تر ہونے لگا ہے، اپنے ماحول ومزاج وغیرہ عناصر کی روشنی میں ان باتوں کا تصفیہ کیا جاسکتا ہے، اسی طرح بہت سے طبقات کے نزدیک عبادات کی بجاآوری مکمل دین ہے جس سے آدمی پورا دیندار بن جاتا ہے، کچھ لوگوں نے اخلاق کی درستگی کو اس کے لئے کافی سمجھ رکھا ہے۔

ہمارے اردو خواں طبقات میں مختلف مکاتب فکر کے جو اردو فتاویٰ کا ذخیرہ تیار ہوا ہے، اس کو دیکھا جاتا ہے تو بھی اس خیال کی پوری پوری تصدیق کی جاسکتی ہے۔ یہ فتاویٰ

دینی معاشرے اور دین سے وابستہ افراد کی ایک واقعی تصویر کے مانند ہے چنانچہ لوگ اپنے درپیش مسائل وافکار کے متعلق عام طور دار الافتاؤں کی طرف مراجعت کرتے ہیں اور وہاں سے اپنی علمی ودینی پیاس بجھاتے ہیں، لیکن کسی بھی مکتب فکر کے چھپے ہوئے فتاوٰی کو ٹٹولا جائے تو واضح ہوجاتا ہے کہ اس میں خرید و فروخت، کرایہ داری، زمینداری وکاشتکاری، آپس کے نزاعات واختلافات وغیرہ معاملات کی بنسبت عبادات اور روایتی عقائد ہی کے سوالات زیادہ ہوتے ہیں، اخلاقیات ومعاشرت کے مسائل شاید نہ ہونے کے برابر ہوتے ہیں۔

دوسری خصوصیت: ابدیت

دین اسلام کی دوسری بڑی خصوصیت یہ ہے کہ یہ ایک ابدی دین ہے یعنی کسی خاص زمانے کے لئے نازل نہیں ہوا، بلکہ قیامت تک آنے والے انسانوں کے لئے یہ دین نازل ہوا ہے اور اس دین متین کے جلوہ گر ہوجانے کے بعد کوئی اور دین نہیں آئے گا۔

اس بات کو خصوصیت ٹھہرانے کی وجہ یہ ہے کہ ہر دین اپنا رشتہ ایک نادیدہ ہستی کے ساتھ جوڑتی ہے کہ یہ دین اسی کی طرف سے آیا ہے جس کو "اللہ تعالیٰ" کے پیارے نام سے یاد کرتے ہیں اور ہر مذہب کا اعتقاد ہے جو بالکل سچ اور ہر لحاظ سے مبنی بر حقیقت ہے کہ:

الف: اللہ تعالیٰ ماضی، حال اور مستقبل کی تمام تر باتوں کو جانتے دیکھتے ہیں، اس کے علم اور دیکھنے سننے سے کوئی چیز باہر نہیں ہے۔

ب: وہ ہر چیز پر قادر وغالب بھی ہے، جو چاہے کرتا ہے، کوئی چیز اس کو کسی ارادے کی تکمیل سے روکنے کا تصور تک نہیں کر سکتی۔

ج: وہ انسانیت کا خیر خواہ اوران پر رحم وکرم کرنے والا ہے، انسانیت دشمنی یا بد خواہی سے وہ بالکل پاک وبَری ہے۔

جب یہ تین باتیں سچ ہیں اور یقیناً سچ بلکہ سچائی کی بنیاد ہے تو اس کے بعد جب کوئی دین ایسی ذات کی طرف سے نازل ہوتا ہے اور انسانیت کو اس کے اختیار کرنے کا حکم دیا جاتا ہے اور ساتھ کھلے لفظوں میں یہ اعلان واشتہار بھی ہوتا ہے کہ یہ دین صرف ایک صدی یا چند صدیوں کے لئے نہیں ہے بلکہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اسی دین کو اختیار کرنا ہوگا اور قیامت تک خواہ کتنا ہی عرصہ لگے، اسی دین کو تھامے رکھنا ہے تو یہ تمام باتیں اس بات کا صاف پتہ دیتی ہیں کہ اس دین کی تعلیمات میں ہر زمانے کے تقاضوں کی مصلحت ودیعت رکھی گئی ہے اور اس میں یہ قابلیت ہے کہ ہر زمانے وماحول کو درست اور شاندار طریقے سے چلاسکے اور جب ایسی ہستی کی جانب سے اس کو قبول کرنے کا بار بار تاکیدی حکم دیا جارہا ہے تو یہ ضرور اس بات کی دلیل ہے کہ ایک بار جب یہ دین نازل ہوا تو اس کے بعد انسانیت کی حقیقی فلاح وبہبود اسی دین کے ساتھ وابستہ رہے گا اور اس کے دائیں بائیں طوف پھرنے میں انسانیت کا بہت کچھ خسارہ اور نقصان مضمر ہے۔

دین اسلام کے ابدی ہونے کی بات قرآن وحدیث کے سینکڑوں نصوص سے ثابت ہوتی ہے، بعض جگہ تو صاف صاف اس بات کی خبر دی گئی اور بعض جگہ دیگر طریقوں سے یہ مضمون سمجھادیا گیا ہے، مثال کے طور پر یہ بات محتاج بیان نہیں ہے کہ دین ومذہب کا علمبردار نبی ہوتا ہے، وہی خدا کی طرف سے انسانیت کے نام کوئی پیغام ہدایت لے کر آتا ہے، لہٰذا کسی نبی کے بغیر دین نازل ہونے کا تصور نہیں ہوسکتا، لیکن قرآن وسنت کے سینکڑوں نصوص میں یہ قطعی خبر دیدی گئی ہے کہ حضرت محمد ﷺ کے

بعد کسی نئے نبی نے دنیا میں نہیں آنا اور اگر کوئی بد فہم اس عالی منصب کا دعویٰ کرے تو بلا شبہ وہ جھوٹا اور کذاب ہی ہو گا۔اب جب نبوت کا سلسلہ آپ ﷺ پر ختم کر دیا گیا اور دین اسلام نے تواتر کے ساتھ اس کا اعلان واشتہار کیا تو نئے دین کے آنے کا راستہ کیا باقی رہا ؟اوراب اس کے بعد نیا دین ومذہب آئے تو کہاں سے آئے ؟لہٰذا ختم نبوت کے اعلان میں دین اسلام کے ابدی ہونے کا بھی اعلان واظہار ہے۔

بعض نصوص میں صراحت کے ساتھ بھی یہ مضمون بیان کر دیا گیا ہے،مثال کے طور پر "مسند احمد" کی روایت ہے:

عَنْ حَكِيمِ بْنِ مُعَاوِيَةَ، عَنْ أَبِيهِ، أَنَّ رَسُولَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: " أَنْتُمْ تُوفُونَ سَبْعِينَ أُمَّةً أَنْتُمْ آخِرُهَا، وَأَكْرَمُهَا عَلَى اللهِ"[1]

ترجمہ:"حکیم بن معاویہ اپنے والد سے روایت کرتے ہے کہ رسول ﷺ نے فرمایا: تم ستر امت پورا کرنے والے ہو، تم ان میں سب سے آخر میں ہو اور اللہ کے نزدیک سب امتوں میں معزز امت ہو"۔

دین اسلام کے علاوہ اگر کہیں کسی دین ومذہب یا نظریہ ونظام کو اس بات پر اصرار بھی ہے کہ اس نے بھی ہمیشہ رہنا ہے اور آخر تک انسانیت کی سیادت وقیادت کا جھنڈا ہاتھ میں لہرانا ہے تو بھی اس کی تعلیمات ومضمرات پر غور کرنے سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ نرا دعویٰ اور واقعیت سے کھوکھلی ہوئی خوش فہمی ہے اور وہ اس قابل بالکل بھی

---

[1] مسند أحمد ط الرسالة،ج ۳۳ ص ۲۲۸.

نہیں ہے کہ حال و مستقبل میں پوری انسانیت کی رہنمائی کا گران قدر فریضہ اپنے ناتواں کندھوں پر اٹھا سکے۔

تیسری خصوصیت: شمولیت

"شمولیت" کا مطلب یہ ہے کہ یہ دین کسی خاص قوم وقبیلہ یا مخصوص طبقے اور علاقے کے ساتھ مقید نہیں ہے کہ صرف وہی اس دین کے مخاطب ہیں اور وہی اس دین کے احکام پر چل کر کامیابی سے ہمکنار ہو سکتے ہیں بلکہ دنیا جہاں کی تمام انسانیت اور انسانیت کے ہر ہر فرد تک اس دین متین کا پیغام متوجہ ہوتا ہے چاہے وہ کسی بھی زمانے، علاقے اور نسل وشکل کا کیوں نہ ہو۔ حضرت آدم علیہ الصلاۃ والسلام کا کوئی بیٹا اس دین کی تعلیمات پر عمل کرنے سے محروم نہیں ہے اور نہ ہی کسی کو یہ چھوٹ دی گئی ہے کہ چاہے تو اس کو اختیار کرلے اور چاہے تو کسی اور راہ پر چلے۔ دوسرے لفظوں میں اس کو یوں تعبیر کر سکتے ہیں کہ دین اسلام کوئی قومی، وطنی یا علاقائی وملکی دین نہیں ہے بلکہ ایک عالمگیر دین اور جہانگیر مذہب ہے۔

اس کے بالمقابل دین یہودیت یا نصرانیت کو دیکھا جائے تو وہ مخصوص اقوام کے لئے مختص ہیں، چنانچہ ان ادیان کی بنیادی مذہبی کتابوں میں بھی یہ بات لکھی ہوئی موجود ہے اور خود ان کے پیروکاروں کا برتاؤ بھی یہی ہے۔

"شمولیت" کہنے کو تو ایک لفظ ہی ہے لیکن غور کیا جائے تو اس کی تہہ میں خوبیوں کے متعدد نگینے جڑے ہوئے ہیں، اور ان میں سے کئی خوبیاں ایسی بھی ہیں کہ اسلام دشمن طاقتیں ماضی بعید سے اب تک تسلسل کے ساتھ اس کا ڈھنڈورا پیٹتی رہتی ہیں اور اپنے

تہذیب وثقافت کے ساتھ اس کو مربوط کرنے کی کوشش یا کم از کم اس کی نمائش کرتی رہتی ہیں، مثال کے طور پر قومی وحدت، آپس میں اتحاد واتفاق اور مساوات۔

اس خصوصیت کی دلیل قرآن وحدیث کے متعدد نصوص ہیں، مثال کے طور پر قرآن کریم میں ارشادِ خداوندی ہے:

﴿قُلْ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنِّي رَسُولُ اللهِ إِلَيْكُمْ جَمِيعًا الَّذِي لَهُ مُلْكُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ يُحْيِي وَيُمِيتُ فَآمِنُوا بِاللهِ وَرَسُولِهِ النَّبِيِّ الْأُمِّيِّ الَّذِي يُؤْمِنُ بِاللهِ وَكَلِمَاتِهِ وَاتَّبِعُوهُ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ﴾[1]

ترجمہ: "کہہ دو اے لوگو! میں تم سب کی طرف اللہ کا رسول ہوں جس کی حکومت آسمانوں اور زمین میں ہے اس کے سوا اور کوئی معبود نہیں وہی زندہ کرتا اور مارتا ہے پس اللہ پر ایمان لاؤ اور اس کے رسول نبی امی پر جو کہ اللہ پر اور اس کے سب کلاموں پر یقین رکھتا ہے اور اس کی پیروی کرو تاکہ تم راہ پاؤ"۔

یہاں حضور نبی اکرم ﷺ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ حکم مل رہا ہے کہ پوری انسانیت کے لئے اپنی بعثت ورسالت کا اعلان کریں، پھر پوری انسانیت کو یہ ضروری حکم بھی دیا جارہا ہے کہ وہ خدا تعالیٰ پر ایمان لانے کے ساتھ ساتھ حضور ﷺ کی رسالت پر ایمان لائیں، اوران کی بعثت ورسالت کی بھی تصدیق کریں، اور ایمان واسلام سے عبارت

---

[1] الأعراف: آية ١٥٨.

ہے۔ خدا تعالیٰ اور حضور ﷺ پر ایمان لانے کے ساتھ ہی انسان مسلمان بن جاتا ہے اور تمام شرعی احکام وہدایات اس کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں۔

دوسری جگہ ارشاد ہے:

﴿وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِلْعَالَمِينَ﴾[1]

ترجمہ: "اور ہم نے تو تمہیں تمام جہان کے لوگوں کے حق میں رحمت بنا کر بھیجا ہے"۔

یہاں حضور ﷺ کی رسالت کو تمام کائنات کے لئے رحمت قرار دیا جارہا ہے، اور کھلے لفظوں میں تاکید وحصر کے ساتھ اس کا اعلان کیا جارہا ہے۔ اور عالم میں انسانیت بطریق اولیٰ داخل ہے۔ اس سے صاف واضح ہوتا ہے کہ حضور ﷺ کی بعثت ورسالت کا فائدہ کسی خاص قوم وطبقہ یا ایک مخصوص زمانے کے انسانوں کا نہیں ہے بلکہ پوری انسانیت کے لئے یہ سراپا نعمت ورحمت ہے جس میں دنیا جہاں کے تمام انسان داخل ہیں بلکہ "عالمین" کا مفہوم اس سے بھی زیادہ وسیع تر ہے۔

اب حضور ﷺ کی ذات بابرکات سے کائنات کو متنوع قسم کے فوائد نصیب ہوئے اور ہو رہے ہیں، لیکن سب سے بڑا فائدہ اور اہم فائدہ یہ تھا کہ انسانیت کا رشتہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ جوڑلیں، اور دکھی انسانیت کو انسان کی بندگی سے نکال کر خدا تعالیٰ کی بندگی کے دائرے میں لے آئے، اور یوں اس کا اخروی انجام وعاقبت سلامتی وعافیت والا ہو جائے۔ اور ظاہر ہے کہ یہ باتیں دین اسلام کی ہی دوسری تعبیر ہے، لہٰذا پوری انسانیت

---

[1] الأنبياء: آية ۱۰۷۔

کے لئے دینِ اسلام کو عام رکھنا ضروری ہے تاکہ آپ ﷺ کی رسالت وبعثت کا واقعی معنٰی میں "رحمت" ہونا متصور ہو سکے۔

ایک اور جگہ فرمانِ خداوندی ہے:

﴿وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا كَافَّةً لِلنَّاسِ بَشِيرًا وَنَذِيرًا وَلَكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ﴾[1]

ترجمہ: "اور ہم نے آپ کو جو بھیجا ہے تو صرف سب لوگوں کو خوشی اور ڈر سنانے کے لیے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے"۔

اس آیت مبارکہ میں تو صاف لفظوں یہ اعلان کیا گیا ہے کہ حضور ﷺ کی رسالت تمام انسانوں کے لئے عام ہے اور آپ ﷺ کا پیغام سب لوگوں کی طرف یکساں متوجہ ہے۔ "مسند احمد" میں حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا:

" أُعْطِيتُ خَمْسًا لَمْ يُعْطَهُنَّ أَحَدٌ قَبْلِي: بُعِثْتُ إِلَى الْأَحْمَرِ وَالْأَسْوَدِ، وَكَانَ النَّبِيُّ إِنَّمَا يُبْعَثُ إِلَى قَوْمِهِ خَاصَّةً، وَبُعِثْتُ إِلَى النَّاسِ عَامَّةً، وَأُحِلَّتْ لِي الْغَنَائِمُ، وَلَمْ تُحَلَّ لِأَحَدٍ قَبْلِي، وَنُصِرْتُ بِالرُّعْبِ مِنْ مَسِيرَةِ شَهْرٍ، وَجُعِلَتْ لِي الْأَرْضُ طَهُورًا وَمَسْجِدًا، فَأَيُّمَا رَجُلٍ أَدْرَكَتْهُ الصَّلَاةُ، فَلْيُصَلِّ حَيْثُ أَدْرَكَتْهُ "[2]

---

[1] سبا: آیة۲۸.

[2] مسند أحمد ط الرسالة، مسند المكثرين من الصحابة، مسند جابر بن عبد الله رضي الله عنه، ج۲۲ ص ۱۶۵.

ترجمہ: "مجھے پانچ ایسی چیزیں دی گئی ہیں جو مجھ سے پہلے کسی کو نہیں دی گئی ہیں۔(۱) مجھے ہر سرخ اور کالے کی طرف بھیجا گیا ہے۔(۲) اور مجھ سے پہلے انبیاء کو صرف ان کے قوم کی طرف بھیجا جاتا، اور مجھے تمام انسانوں کی طرف بھیجا گیا ہے۔(۳) اور غنیمتوں کو میرے لئے حلال کیا گیا ہے اور مجھ سے پہلے کسی کے لئے حلال نہیں تھے۔(۴) ایک مہینے کے فاصلے پر میرا رعب (دشمن کے دل میں ڈال کر) میری مدد کی گئی۔(۵) اور میرے لئے زمین کو پاک (یعنی اس سے تیمم کرنا) اور مسجد (یعنی تمام زمین پر نماز پڑھنا) بنائی گئی ہے پس جس آدمی پر جہاں بھی نماز کا وقت آجائے تو وہاں نماز پڑھے"۔

چوتھی خصوصیت: ناسخیت

دین اسلام تمام آسمانی مذاہب کے بعد طلوع ہوا ہے، یہودیت و نصرانیت وغیرہ ادیان پہلے سے اس دھرتی پر موجود تھے، اور دنیا کے مختلف اکناف میں اس کے ماننے والے ہزاروں عقیدت مند موجود و مشہور تھے، اتنے میں اسلام کا چاند طلوع ہوتا ہے اور طلوع ہوتے ہی یہ دعویٰ کرتا ہے کہ حقانیت اور نجات اسی میں منحصر ہے، اس کے بعد جو شخص اس کے علاوہ کسی اور راستہ میں حقانیت ڈھونڈے گا یا نجات تلاش کرے گا، وہ خدا تعالیٰ کے نزدیک قبول نہیں ہوگا، اور اس کو کسی طرح نجات کا منہ دیکھنا نصیب نہیں ہوگا، اب نجات صرف اسی ایک دین میں منحصر ہے اور اس کے علاوہ ادیان و مذاہب منسوخ ہوچکے ہیں اور کسی عقل مند شخص کو یہ بات بتانے کی ضرورت نہیں ہے کہ منسوخ چیز پر عمل کرنا کیسا ہے؟ اور ناسخ و منسوخ باتوں میں کس کو ترجیح دینا مناسب ہے؟

ارشاد خداوندی ہے:

﴿إِنَّ الدِّينَ عِنْدَ اللهِ الْإِسْلَامُ وَمَا اخْتَلَفَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ إِلَّا مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًا بَيْنَهُمْ وَمَنْ يَكْفُرْ بِآيَاتِ اللهِ فَإِنَّ اللهَ سَرِيعُ الْحِسَابِ فَإِنْ حَاجُّوكَ فَقُلْ أَسْلَمْتُ وَجْهِيَ لِلّٰهِ وَمَنِ اتَّبَعَنِ وَقُلْ لِلَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ وَالْأُمِّيِّينَ أَأَسْلَمْتُمْ فَإِنْ أَسْلَمُوا فَقَدِ اهْتَدَوْا وَإِنْ تَوَلَّوْا فَإِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلَاغُ وَاللهُ بَصِيرٌ بِالْعِبَادِ﴾[1]

ترجمہ: "بیشک دین اللہ کے ہاں فرمابرداری ہی ہے اور جنہیں کتاب دی گئی تھی انہوں نے صحیح علم ہونے کے بعد آپس کی ضد کے باعث اختلاف کیا اور جو شخص اللہ کے حکموں کا انکار کرے تو اللہ جلد ہی حساب لینے والا ہے. پھر بھی اگر تجھ سے جھگڑیں تو ان سے کہہ دے کہ میں نے اپنا منہ اللہ کے تابع کیا ہے اور ان لوگوں نے بھی جو میرے ساتھ ہیں اور ان لوگوں سے کہہ دے جنہیں کتاب دی گئی ہے اور ان پڑھوں سے آیا تم بھی تابع ہوتے ہو پھر اگر وہ تابع ہو گئے تو انہوں نے بھی سیدھی راہ پالی اور اگر وہ منہ پھیریں تو تیرے ذمہ فقط پہنچا دینا ہے اور اللہ بندوں کو خوب دیکھنے والا ہے"۔

اسی سورت میں دوسری جگہ فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَمَنْ يَبْتَغِ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِينًا فَلَنْ يُقْبَلَ مِنْهُ وَهُوَ فِي الْآخِرَةِ مِنَ الْخَاسِرِينَ﴾[2]

---

[1] آل عمران: آیۃ ۲۰،۱۹.

[2] آل عمران: آیۃ ۸۵.

ترجمہ: "اور جو کوئی اسلام کے سوا اور کوئی دین چاہے تو وہ اس سے ہر گز قبول نہیں کیا جائے گا اور وہ آخرت میں نقصان اٹھانے والوں میں سے ہو گا"۔

اگر کوئی شخص سرے سے دین اسلام کے حق ہونے کو ہی تسلیم نہیں کرتا، تو وہ اس خصوصیت کو تسلیم کرنے میں بھی تامل کر سکتا ہے اور ایسے شخص سے یہ کوئی بعید نہیں ہے کہ وہ اس خصوصیت کو درست ماننے سے انکار ہی کر بیٹھے، لیکن جو شخص ایک بار اس ثابت شدہ حقیقت کی تصدیق کرے کہ یہ دین بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل کردہ ہے تو اس کے لئے اس بات کی کوئی گنجائش نہیں ہے کہ اس بات میں ذرا بھر بھی تردد سے کام لے اور دین اسلام کی بنیادی مزاج "حنفیت" (یعنی تمام باطل ادیان سے یکسو ہو کر ہی اور لو لگا کر اس دین کو قبول کرنے) سے اعراض کر کے کسی اور فکر و فلسفے کا شکار ہو جائے۔

پانچویں خصوصیت: معقولیت

دین اسلام کی ایک خصوصیت "معقولیت" بھی ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ اس دین حق کے تمام تر احکام و تعلیمات عقل سلیم اور فطرت سلیمہ کے مطابق ہیں، اور اس پورے دین میں کوئی ایک بھی ایسا حکم نہیں ہے جو سلیم عقل و فطرت کے مقتضیٰ کے خلاف ہو۔ قرآن کریم نے متعدد جگہوں پر عقل سے کام لینے کی ترغیب دی ہے اور اس پر ابھارا ہے۔

البتہ اس مسئلہ کے متعلق دورِ حاضر میں افراط و تفریط کے مظاہر بہت سامنے آتے رہتے ہیں، اس لئے درجِ ذیل نکات کا ذکر کرنا اور ان کا استحضار رکھنا ضروری معلوم ہوتا ہے اور ان باتوں کا اگر اچھی طرح تصفیہ کیا جائے تو امید ہے کہ مسئلہ صاف ہو جائے گا اور اس حوالہ سے کوئی گمراہی یا غلط فہمی پیدا نہ ہو گی۔

عقل کا معیار و مصداق

پہلی بات یہ ہے کہ یہاں جس عقل کی بنیاد پر اسلام کو معقول مذہب قرار دیا جارہا ہے، اس سے مراد کیا ہے؟ ہر کس و ناکس کا عقل مراد ہے یا مخصوص افراد کا؟ اور 8
جن کی عقل کو مد نظر رکھنا یہاں مقصود ہے، کیا ان کی ہر بات اور سارے عقلی تقاضوں کو معیار بنایا جائے گا یا خاص خاص باتوں کو؟

اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں عقل سے ماوشما کی عقل مراد نہیں ہے بلکہ خاص عقل سلیم مراد ہے جو فطری جذبات، طبعی خواہشات، گرد و پیش ماحول کی آلودگیوں اور رسوم ورواج وغیرہ عناصر کی خلل اندازی سے سالم و محفوظ ہو، فطرتِ سلیمہ کا حاصل بھی تقریباً یہی ہے۔ کوئی عقل عقل سلیم ہے یا سقیم؟ اس کا فیصلہ انسان کے ظاہری اعمال واقوال سے ہو جاتا ہے، لہٰذا ظلم وعصیان کے مرتکب لوگوں کے عقول اس معنیٰ میں عقل سلیم بالکل نہیں ہے اور دین اسلام کی تعلیمات اگر ایسے عقل کے موافق نہ ہوں تو کوئی پریشانی یا اشکال کی بات نہیں ہے بلکہ بسا اوقات ایسی عقول کی مخالفت ہی صدق وسچائی اور انصاف وعدالت کی نشانی ہوتی ہے۔ [1] کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے:

إذا أتتك مذمّتي منّ ناقص فهيَ الشّهادةُ لي بأنّي كامل

ترجمہ: "جب کم عقل آدمی آپ کو میری برائی بیان کرے تو بس یہ میرے کامل ہونے کی دلیل ہے"۔

ایک دوسرے شاعر نے یہی بات دوسرے انداز میں کہی، وہ کہتا ہے:

---

[1] اس سے متعلق مزید تفصیل کے لئے اس ناکارہ کی کتاب "دلیل واستدلال کے اسالیب اور عقل ونقل کا مقام" ملاحظہ فرمائیں۔

إِذَا رَضِيَتْ عَنِّي كِرَامُ عشِيرَتِي ... فَلاَ زَالَ غَضْبَاناً عَلَيَّ لِئَامُها

ترجمہ: "جب میرے قبیلے کے معزز لوگ مجھ سے راضی ہو، پھر بھی قبیلے کے کمینے لوگ مجھ سے ناراض ہی ہوں گے۔

خلافِ عقل اور ماورائے عقل میں فرق

دوسری بات جس کا ذہن وفکر کے دریچوں میں حاضر رکھنا ضروری ہے وہ یہ ہے کہ یہاں دو چیزیں بالکل الگ الگ ہیں:

۱: خلاف عقل: اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ عقل کے پاس غلط ہونے کی کوئی ناقابل تردید دلیل موجود ہو، مثال کے طور پر وہ سچے مشاہدے کے خلاف بات ہو، یا دیگر یقینی باتوں سے سراسر متصادم ہو یا اس کے علاوہ کوئی اور قطعی دلیل عقل کے پاس موجود ہو جو اس دعویٰ کے باطل ہونے پر صاف صاف دلالت کرتا ہو۔

۲: ماورائے عقل: اس سے وہ چیزیں مراد ہوتی ہیں جو عقل کے احاطہ سے باہر ہو اور عقل ان کا براہ راست ادراک ہی نہ کر سکے، چہ جائیکہ اس کے درست یا غلط ہونے کا فیصلہ کرے، کیونکہ جس طرح کان، آنکھ وغیرہ ظاہری حواس کے لئے ایک خاص حد مقرر ہے اور اس حد سے باہر امور کا وہ ادراک واحساس نہیں کر سکتے، یوں ہی عقل کا بھی ایک دائرہ کار ہے اور یہ عقل ان باتوں کے ادارک کرنے سے قاصر وعاجز رہتا ہے جو اس دائرہ کے سے اوپر ہوتی ہیں۔ وہاں اگر کوئی چیز انسان کی رہبری کا فریضہ انجام دے سکتی ہے تو وہ وحی ہی ہے۔ لہٰذا یہ ضروری نہیں ہے کہ جو چیز عقل کے احاطہ سے ماوراء ہو، وہ خلاف عقل ہو گی، بلکہ یہ غلط اور بے بنیاد ہے۔ ان دونوں باتوں میں فرق نہ کرنے سے بڑی ہی غلط فہمیاں جنم لیتی ہیں۔

ان دونوں باتوں کی وضاحت کے بعد اب اس پانچویں خصوصیت کا حاصل یہ ہوا کہ دین اسلام کے اصول وفروع وغیرہ تمام تر تعلیمات وہدایات میں کوئی ایک حکم بھی ایسا نہیں ہے جو عقل سلیم اور فطرت سلیمہ کے خلاف ہو اور کوئی واقعی عقلی دلیل اس کے خلاف موجود ہو۔

چھٹی خصوصیت: اعتدال وتوازن

دین اسلام کا خود یہ دعویٰ ہے کہ اس میں توسط اور اعتدال کی اچھی طرح پاسداری کی گئی ہے قرآن کریم میں ارشاد خداوندی ہے:

﴿ وَكَذَلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطًا لِتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُونَ الرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيدًا ﴾[1]

ترجمہ: "اور اسی طرح ہم نے تمہیں برگزیدہ امت بنایا تاکہ تم اور لوگوں پر گواہ ہو اور رسول تم پر گواہ ہو"۔

اس کی تفسیر میں مشہور مفسر امام ابن جریر طبری رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں:

قال أبو جعفر: وأنا أرىٰ أن"الوسط" في هذا الموضع، هو"الوسط" الذي بمعنى: الجزءُ الذي هو بين الطرفين، مثل"وسَط الدار" محرَّكُ الوَسط مثقَّله، غيرَ جائز في"سينه" التخفيف.[2]

---

[1] البقرة: آية ۱۴۳.

[2] تفسير الطبري = جامع البيان ت شاكر، البقرة، آية ۱۴۳، ج ۳ ص ۱۴۲.

وأرىٰ أن الله تعالىٰ ذكره إنما وصفهم بأنهم "وسَط"، لتوسطهم في الدين، فلا هُم أهل غُلوٍّ فيه، غلوَّ النصارىٰ الذين غلوا بالترهب، وقيلهم في عيسىٰ ما قالوا فيه - ولا هُم أهلُ تقصير فيه، تقصيرَ اليهود الذين بدَّلوا كتابَ الله، وقتلوا أنبياءَهم، وكذبوا علىٰ ربهم، وكفروا به؛ ولكنهم أهل توسط واعتدال فيه. فوصفهم الله بذلك، إذ كان أحبَّ الأمور إلىٰ الله أوْسطُها.

ترجمہ: امام ابو جعفر" فرماتے ہیں کہ: میں سمجھتا ہوں کہ اس جگہ "وسط" سے مراد وہ حصہ ہے جو دو چیزوں کے درمیان میں ہو، جیسے گھر کا درمیانی حصہ۔ "وسط" میں "سین" مشدد کے ساتھ ہے، اس کے سین کو مخفف پڑھنا جائز نہیں۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ ان لوگوں کا دین میں معتدل ہونے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان کو وسط امت کہا۔ یہ امت نہ عیسائیوں کی طرح دین میں غلو اور زیادتی کرنے والے ہے جس طرح عیسائیوں نے ڈرانے میں غلو کیا اور عیسیٰ علیہ السلام کی شان بیان کرتے میں غلو کیا (یعنی عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کا درجہ دیا)۔ اور نہ یہود کی طرح دین میں کمی کرنے والے ہے کہ جس طرح یہودیوں نے تورات میں ردوبدل کیا اور انبیاء علیہ السلام کو شہید کیا، اور اپنے رب پہ جھوٹ باندھا اور کفر کیا۔ لیکن یہ امت معتدل ہے اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اس امت کو درمیانہ امت کا خطاب دیا۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کو ہر کام میں اعتدال پسند ہے"۔

اوراگر دیگر ادیان ومذاہب کی تعلیمات کے ساتھ مقارنہ کر کے تجزیہ کیا جائے تو اس دعویٰ کی پوری پوری تصدیق ہو جاتی ہے اور یقین حاصل ہو جاتا ہے کہ واقعۃً اس دین متین کے احکام وہدایات میں قدم قدم پر اعتدال وتوازن کے پہلو کا لحاظ رکھا گیا ہے اور پورے دینی ذخیرہ میں افراط و تفریط یا تجاوز و تقصیر کی کوئی شکل موجود نہیں ہے۔ مثال کے طور پر بنی اسرائیل پر بہت سی ایسی چیزیں حرام کر دی گئیں تھیں جو عام استعمال کی چیزیں ہیں اور ان سے بچنا مشکل ہے جبکہ اس دین متین میں وہ چیزیں حلال کر دی گئیں۔ ان کی عبادت قبول ہونے کی نشانی اور توبہ کرنے کا طریقہ وہ نہیں تھا جو اس دین حق میں ہے بلکہ اس میں کافی مشکل کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ عبادات، اور معاملات وغیرہ تمام شعبوں کے متعلق احکام وہدایات میں اگر اسلامی تعلیمات کا دیگر ادیان کی تعلیمات کے ساتھ مقارنہ کر دیا جائے تو اسلام کے دامن میں اعتدال وتوازن کا پہلو مزید اجاگر ہوتا رہتا ہے۔ چنانچہ مشہور مفسر امام راغب اصفہانی رحمہ اللہ اس کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

إن قيل: كيف جعلهم وسطا؟ الخُلُق أم لخلْقٍ خصهم به؟ أم لعلم ركزه فيهم؟ أم لشرع شرعه لهم؟. قيل: قد خصهم بكل ذلك، والظاهر من ذلك هي الشريعة التي إذا اعتبرت بسائر الشرائع وجد لها حد الاعتدال، وهو أن بني إسرائيل لما عتوا كما حكى الله عنهم في غير

موضع شدد عليهم أشياء صارت عليهم إصرا وأغلالاً.۱

ترجمہ: "اس امت کو معتدل اور وسط امت قرار دینے کی وجہ کیا ہے؟ کیا اخلاق کی وجہ سے، یا پیدائش کی وجہ سے، یا اس علم کی وجہ سے جو اللہ نے ان میں رکھا ہے۔ یا شریعت کی وجہ جو اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے مشروع کیا ہے ان کو یہ فضیلت حاصل ہے؟ بعض کے نزدیک ان سب صفات کی وجہ سے ان کو امت وسط قرار دیا گیا ہے۔ ظاہر ان میں سے وہ شریعت ہے جب تمام شرائع میں سے اس کا اعتبار کیا گیا ہو تو اس کے لئے اعتدال کا حد ہوتا ہے، اور وہ یہ کہ جب بنی اسرائیل نے سرکشی کی تو اللہ تعالیٰ نے ان پر بعض چیزوں میں سختی کی جن کا ذکر اللہ تعالیٰ نے مختلف مقامات میں کیا تو ان پر احکامات سخت ہو گئے"۔

اس کے بعد ایک صحیح حدیث سے بھی استدلال کرتے ہیں اور پھر اپنی تحقیق و تلاش کا نتیجہ ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

قال عليه السلام " بعثت بالحنيفية السهلة "، فصارت شريعته متوسطة بين الإفراط الذي هو الإصر والأغلال وبين التفريط الذي هو الإضاعة والإهمال،

ترجمہ: "حضور ﷺ کا ارشاد گرامی ہے کہ: مجھے آسان دین دے کر بھیجا گیا۔ پس حضور ﷺ کی شریعت اس زیادتی کے درمیان جو قید اور زنجیر ہے، اور اس کمی کے درمیان جو ضائع کرنا اور بے کار کرنا ہے ان کے درمیان میں ہے (یعنی نہ اس میں زیادتی ہے اور نہ کمی ہے۔)

---

۱ تفسير الراغب الأصفهاني، البقرة، آية ۱۴۳، ج۱ ص۳۲۹.

ساتویں خصوصیت: صالحیت

"صالحیت" سے یہاں مراد یہ ہے کہ یہ دین ہر زمانے اور ہر جگہ میں انسانیت کے سیادت قیادت کی اہلیت رکھتا ہے اور انسانی زندگی، خواہ وہ ترقی وکمال کی طرف گامزن ہو یا زوال وانحطاط کی طرف روبہ سفر ہو، کسی بھی موقع پر ایسا نہیں ہو سکتا کہ یہ دین معطل وبے کار ہو جائے اور اس کے احکام وہدایات پر عمل کرنا ناممکن یا غلط ثابت ہو جائے[1]۔

یہ جہاں اسلام کی خصوصیت ہے وہاں اس کے حقانیت اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہونے کی دلیل بھی ہے۔ خصوصیت تو اس لئے ہے کہ دیگر ادیان ومذاہب کا یہ حال نہیں ہے چنانچہ ان میں سے جو مذاہب اس بات کے مدعی ہیں کہ وہ اللہ کی طرف سے نازل کردہ ہیں، وہ اپنے اپنے وقت اور ماحول کے مطابق تو درست ومناسب تھے اور اپنے ماحول کے مطابق لوگوں کی رہنمائی اور ان کی سیادت کی صلاحیت بھی رکھتے تھے لیکن زمانہ اور اس میں بسنے والے انسانوں میں جب تبدیلی واقع ہوئی تو اب پوری انسانیت کی رہبری کرنے کی ان میں صلاحیت نہ رہی، خاص کر مادی ترقی کے اس دور میں بلاخوف وتردید یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ ایک اسلام اور صرف یہی دین اسلام ہی اس بات کی قابلیت رکھتا ہے کہ پوری انسانیت کی قیادت کا لگام اس کے ہاتھ میں ہمیشہ کے لئے تھما دیا جائے اور وہی انسانیت کو اس کی "متاع گمشدہ" کی بازیابی کا اہل ہے۔

---

[1] گزشتہ سطور میں جو پہلی اور دوسری خصوصیت ذکر کی گئیں ہیں، ان کے ضمن میں یہ بھی داخل ہے، تاہم مزید اہتمام اور فائدے کی خاطر یہاں اس کو مستقل طور پر ذکر کر دیا گیا۔

اور حقانیت کی دلیل اس لئے ہے کہ انسان خواہ کتنا ہی سمجھ دار وفاضل کیوں نہ ہو، وہ بہر حال اپنے ماحول اور درپیش حالات کا کسی نہ کسی درجہ میں اسیر ہوتا ہے اور اس کی فکر ونظر خواہ کتنی ہی دور رس ذی فراست ہو، لیکن بہر حال مستقبل بعید کے تمام نشیب وفراز کو پورے تفصیل وگہرائی کے ساتھ جانچنے سے قاصر رہتی ہے، وہ اگر پوری ہوشیاری، دانش مندی اور فہم وفراست کے ساتھ بھی مستقبل بعید کے لئے منصوبہ بندی کرنا چاہے تو کسی نہ کسی درجہ میں اس کا یہ پلان ساتھ دینا چھوڑ دیتا ہے اور کوئی نہ کوئی مرحلہ ایسا ضرور آتا ہے جہاں اس کی عقل مندی ناکامی اور نامرادی کا سامنا کر لیتی ہے، درج ذیل دوصورتوں میں خصوصیت کے ساتھ ایسا ہوتا ہے:

الف: جب منصوبہ بندی صرف اپنے گردپیش اور ہم مزاج وماحول کے متعلق نہ ہو بلکہ پوری دنیا سے متعلق ہو۔

ب: منصوبہ بندی کرنے والا کوئی باقاعدہ تعلیم یافتہ ہو نہ ہی کہیں سے اس قسم کی کوئی ڈگری یا تعلیم حاصل کی ہو۔

جبکہ حضور نبی اکرم ﷺ اور ان کی رہنمائی میں یہ دونوں باتیں خصوصی طور پر موجود تھیں اور قرآن وحدیث میں جو بار بار آپ ﷺ کی ایک صفت "امی" ہونے کا تذکرہ کیا جاتا ہے، اس میں ایک خاص راز کی بات یہ بھی ہے کہ "امی" ہونے کے باوجود ایسی کامل رہنمائی کرنا اور اتنا جامع نظام زندگی پیش کرنا ایک ایسا معجزہ ہے جس کے بعد مزید کسی معجزے کی ضرورت نہیں ہوتی، اس کے لئے اگر کوئی چیز ضروری ہے تو وہ فکر وانصاف پسندی ہے اور بس۔

آٹھویں خصوصیت: محفوظیت

دین اسلام کی بنیاد قرآن وحدیث پر ہے اور یہ دونوں چیزیں دین کے لئے ایسے ہی اہمیت رکھتی ہیں جس طرح شہ رگ بدن کے لئے ہوتا ہے، یہ دونوں جس زمانے میں نازل یا صادر ہوئے تھے، اس کو کم از کم چودہ صدیاں بیت چکی ہیں، اس طویل عرصہ میں اسلام دشمن عناصر نے کوئی کسر نہیں چھوڑی جو نت نئے حربے آزما کر اس کی بیخ کنی کرنے میں مصروف رہے اور اسی کو اپنی زندگی کا مقصود و مطلوب بنا رکھا تھا، ساتھ چشم فلک نے بہت سے ایسے سادہ مخلص لیکن ناداں مسلمان بھی کچھ کم نہیں دیکھے جو دین اسلام کے ساتھ وارفتگی کے باوجود اس میں بہت تبدیلی کر رہے تھے، یہاں تک کہ اخلاص کے جذبے سے سرشار ہو کر سینکڑوں نہیں، ہزاروں احادیث بھی گھڑلی گئیں، اور بھی بہت طوفان آئے لیکن ان سب کچھ کے باوجود دین اسلام کا یہ بنیادی ذخیرہ جوں کا توں برقرار رہا اور اس میں کسی قسم کی کوئی زیادتی اور تبدیلی نہ چلی۔ اور آج بھی ہم کیا، غیر مسلم منصف مزاج لوگ بھی پورے وثوق کے ساتھ یہ کہنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ ہمارے پاس جو قرآن موجود ہے، ٹھیک یہ وہی قرآن ہے جو حضور ﷺ پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوا تھا اور حضرات صحابہ کرام (رضی اللہ عنہم) جس کی تلاوت کرتے تھے۔

حالانکہ یہ بہت طویل زمانہ ہے جس میں اگر مخالف ماحول اور متضاد طاقتوں کا وجود نہ بھی ہو، تب بھی کسی چیز کا اپنی واقعی اصل حالت پر برقرار رہنا نہایت مشکل ہے چنانچہ یہ کائنات بڑا تغیر پزیر اور تبدیلی پسند محسوس ہوتا ہے اور شاید اسی لئے فلاسفہ اس کو "عالم کون وفساد" سے بھی تعبیر کرتے ہیں۔

دین اسلام کے حریف ادیان اور ان کی کتابوں اور صحائف کا حال اس سے یکسر مختلف ہے، ان کی اپنی اصل شکل بالکل دستیاب نہیں ہے بلکہ اس قدر خرد برد کیا گیا کہ اب اس کے ماننے والے لوگ بھی بسا اوقات اس کے محفوظ رہنے کے دعویٰ سے دستبردار ہو جاتے ہیں اور ان کی ضمیریں ان کو اندر ہی اندر سے ایسے موقع پر جھنجوڑتی رہتی ہیں جس کی وجہ سے وہ یہ دعویٰ کرنا چھوڑ دیتے ہیں اور کبھی دبے لفظوں میں تحریف کا اعتراف بھی کر لیتے ہیں۔

اس بات کی بنیادی وجہ یہی ہے کہ قرآن کریم کی حفاظت کی ذمہ داری خود اللہ تعالیٰ نے لے رکھی ہے، چنانچہ قرآن کریم میں ارشاد خداوندی ہے:

﴿ إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ ﴾[1]

ترجمہ: "ہم نے یہ نصیحت اتار دی ہے اور بیشک ہم اس کے نگہبان ہیں"۔

عربی زبان کے لحاظ سے یہ خاصہ تاکید کا جملہ ہے چنانچہ "ان" کا لفظ بھی تاکید کے لئے آتا ہے جو مخاطب کے دل سے شک وتردد دور کرنے کے لئے ذکر کیا جاتا ہے اور ہم بالکل بجاطور پر اردو میں اس کا ترجمہ "بے شک" کرتے ہیں، "حافظون" کے شروع میں لام ہے، یہ بھی تاکید کے لئے آتا ہے اور یہ جملہ بھی تاکید والا ہے۔ اتنی تاکید کے ساتھ یہ اعلان کیا جارہا ہے کہ بے شک ہم ضرور "ذکر" کی حفاظت کریں گے۔

---

[1] الحجر: آية ٩.

یہاں "الذکر" سے قرآن کریم مراد ہے اور چونکہ یہی قرآن مجید ہی تمام دین کی بنیاد اور اس کی اصل واساس ہے تو اس کے ضمن میں گویا پورے دین اسلام کی حفاظت کا وعدہ بھی شامل ہوا جس میں احادیث مبارکہ سر فہرست ہیں۔ اس کی حفاظت کے لئے قدرت کی طرف سے ایسا عجیب وغریب انتظام کیا گیا کہ جو خود عجوبہ روزگار ہے، چنانچہ ہزاروں حدیثیں جھوٹی گھڑی گئیں اور حضور ﷺ کی طرف اس کی نسبت کر دی گئی، لیکن قدرت کی جانب سے محدثین کو توفیق دی گئی اور انہوں نے عجیب طریقوں سے اس کی ایسی حفاظت فرمائی اور اس کے نتیجہ میں "اسماء الرجال" جیسے نئے فنون ایجاد ہوئے اور ان قابل قدر مساعی کے نتیجہ میں واقعی احادیث اور موضوع روایات کے درمیان فرق وامتیاز کرنا کچھ مشکل نہ رہا، دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی رہ گیا۔

یہ تو قرآن کریم کا حال ہے، جبکہ دیگر کتابوں کی حفاظت کا وعدہ اللہ تعالیٰ نے خود نہیں فرمایا بلکہ متعلقہ لوگوں کے ذمہ یہ فریضہ عائد فرمایا تھا کہ وہ اپنے دین وکتاب پر عمل بھی کرتے رہے اور ساتھ اس کی حفاظت بھی انجام دیتے رہے۔ "سورۃ مائدہ" میں ہے:

﴿ إِنَّا أَنزَلْنَا التَّوْرَاةَ فِيهَا هُدًى وَنُورٌ يَحْكُمُ بِهَا النَّبِيُّونَ الَّذِينَ أَسْلَمُوا لِلَّذِينَ هَادُوا وَالرَّبَّانِيُّونَ وَالْأَحْبَارُ بِمَا اسْتُحْفِظُوا مِن كِتَابِ اللَّهِ وَكَانُوا عَلَيْهِ شُهَدَاءَ ﴾[1]

---

[1] المائدۃ: آیۃ ۴۴.

ترجمہ: "ہم نے تورات نازل کی کہ اس میں ہدایت اور روشنی ہے اس پر پیغمبر جو اللہ کے فرمانبردار تھے یہود کو حکم کرتے تھے اور اس کی خبر گیری پر مقرر تھے"۔

خلاصہ یہ ہوا کہ ادیان ومذاہب کے غیر معمولی ہجوم میں دین اسلام ہی واحد ایسا دین ہے جس کے تمام احکام وہدایات صدیوں گزرنے کے باوجود بالکل محفوظ ومامون ہیں حالانکہ جتنی مخالفتیں، عداوتیں اور تدبیریں اس کے خلاف استعمال کی گئیں ہیں، ان کا کسی دین ومذہب سے سامنا نہیں کرنا پڑا۔

اس کو خصوصیات کے ذیل میں ذکر کرنے کی ایک وجہ یہ پیغام دینا بھی ہے کہ آج کا انسان واقعی آسمانی ہدایات پر عمل کرنا چاہتا ہے تو اس کا واحد طریقہ یہی ہے کہ قرآن کریم کے دامن میں پناہ لے لے۔

اہل مغرب اسلام سے برسرپیکار کیوں؟

یہاں بجاطور پر یہ سوال اٹھنا چاہیے کہ گزشتہ سطور میں دین اسلام کی جو کچھ خصوصیات وامتیازات بیان کی گئی ہیں، اگر یہ سچ ہیں جیسا کہ ذکر کردہ تفصیلات ودلائل سے واضح ہوتا ہے تو اس کے باوجود کیوں لوگ اس سے حد درجہ دل برداشتہ ہیں؟ مغربی دنیا کے لاکھوں ہی نہیں، بلکہ کروڑوں افراد عقل وفکر کے باوجود نہ صرف یہ کہ اس کو قبول کرنے پر آمادہ نہیں ہیں، بلکہ اس کو مختلف نقائص اور کمزوریوں کا حامل گردانتے ہیں اور نظریہ وکردار ہر سطح پر اس کے مقابل صف میں کھڑے ہوکر اس کے خلاف سرگرم اور ہر قسم جنگوں میں اپنا متاع زندگی تک قربان کررہے ہیں! یہ کیا ہی عجیب بات ہے کہ نہ دین کی اہمیت وضرورت سے انکار کرنا ممکن ہے اور نہ اسلام کی ذکر کردہ خوبیوں وخصوصیات کو جھٹلانا

آسان ہے لیکن اس کے باوجود کروڑوں عقل مند افراد کی طرف سے یہ ہدف تنقید اور نشانہ مذمت وملامت ہی بنا ہے؟ ایسا آخر کیوں ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ حقانیت کا معیار لوگوں کا رویہ اور برتاؤ نہیں ہے اور نہ یہ کوئی علمی طریقہ کار ہے کہ کسی چیز کی حقانیت جانچنے کے لئے لوگوں کے عملی تعامل کو بنیاد قرار دیا جائے جس کی ایک بڑی اور بنیادی وجہ یہ ہے کہ لوگ جو موقف اپناتے ہیں، اس کے مختلف عوامل و محرکات ہو سکتے ہیں، اسی بنیاد پر بسا اوقات حق کی جستجو میں اور کبھی حق کے پہچاننے میں غلطیاں بھی ہو جاتی ہیں، اس لئے ضروری نہیں ہے کہ لوگوں کے تعامل اور ان کے موقف پر کلی اعتماد کیا جا سکے، بلکہ اس کی بجائے درست طریقہ اور متوازن طرزِ عمل یہی ہے کہ دلیل کی بنیاد پر بات کی جائے اور اس کو اچھائی برائی کا معیار و ترازو قرار دیا جائے۔

جہاں تک اہل مغرب وغیرہ کا اس دین حق کے خلاف میدان میں اترنا ہے تو ان کی تاریخ، معاشرت، تصورات، اسلام کے حوالہ سے ان کے شبہات واشکالات اور ان کی واقعی صورت حال کو دیکھ کر گمان قریب بہ یقین حاصل ہو جاتا ہے کہ ان کی اس دین دشمنی کی وجہ کوئی عقل وفکر یا کوئی معقول حکمت وفلسفہ نہیں ہے، ایسا نہیں ہوا کہ انہوں نے پورے انصاف و دیانت داری کے ساتھ اس دین حق کے جملہ تعلیمات پر کچھ عرصہ تک غور وخوض کیا، عقلی اور علمی پیمانوں سے اس کی جانچ وپڑتال کر ڈالی اور اس کے نتیجے میں دین اسلام کی ہدایات میں کوئی واقعی کمزوری معلوم کر لی اور اس کے بعد ہی اس کی دشمنی پر اپنی کمر ہمت کس لی۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ان بیچاروں کا واسطہ ایک ایسے "دین" سے پڑا تھا جس میں انسانی آمیزش کا غلبہ بہت زیادہ ہو گیا تھا اور اس ناحق

ملاوٹ کی وجہ سے واقعۃً اس کی اصلی شکل ایسی مسخ ہوئی تھی کہ کوئی بھی ایسا شخص اس کو آسمانی ہدایت یا خدائی تعلیم کہنے کی جسارت ہی نہ کر سکتا تھا جس کو عقل سلیم اور فطرت سلیمہ کا کچھ حصہ بھی نصیب ہو، اس لئے ایسی چیز کی مخالفت کرنا اور اس کی ناحق عمارت کو زمین بوس کرنے میں تو شاید ان کو کسی حد تک معذور ہی سمجھا جائے، لیکن صدہا افسوس اس بات پر کرنا ہے کہ انہوں نے اس ناتمام استقراء سے یہ کلی نتیجہ کشید کرنے کی سنگین غلطی کر ڈالی کہ ہر دین ومذہب ایسا ہی ہوگا، انہوں نے اسلام کو بھی دین کلیسا پر قیاس کر کے اس کی تعلیمات وہدایات کو سرے سے درخور اعتناء ہی نہیں سمجھا۔ یہ ناحق قیاس ان کی بہت بڑی فکری غلطی اور عقلی ناانصافی تھی، اور یہی وہ بنیادی پتھر ہے جس کی وجہ سے وہ دین اسلام کے خلاف بھی صف آراء ہوئے۔

مولانا ابو احمد عبد اللہ لدھیانوی صاحب رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

"نشاۃ جدیدہ کے عہد میں جب یورپ کی نئی علمی تحریک رونما ہوئی تو اس تحریک کا مقابلہ ان مذہبی عیسائیوں سے ہوا جنہوں نے اپنے مذہبی معتقدات کو قدیم یونانی فلسفہ وحکمت کی بنیادوں پر قائم کر رکھا تھا۔ ظاہر ہے کہ جس مذہب کی بنیاد ایسے فلسفہ وحکمت پر رکھی جائے گی جو تغیر پزیر چیزیں ہوں، ایسا مذہب نئی ارتقائی تحریکوں کے مقابل میں کب ٹھہر سکتا ہے! پس جب ان مذہبی لوگوں نے اس نئی تحریک کو قوت سے روکنا چاہا تو یہ تحریک تشدد سے دبنے کی بجائے اور بڑھتی چلی گئی حتیٰ کہ حریت فکر کے سیلاب نے مذہبی اقتدار کا خاتمہ کر دیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اس کے بعد نفس مذہب۔ خواہ وہ کوئی بھی مذہب ہو۔ اس تحریک کا مد مقابل قرار دیا گیا۔ اور نئی تحریک کے علم برداروں نے لازم سمجھا کہ خدا، یا کسی فوق الطبیعت ہستی کو فرض کئے بغیر کائنات کے معتے کو حل کیا جائے اور ہر اس طریقہ کو خلافِ حکمت قرار دیا جائے جس میں خدا کا وجود فرض کر کے مسائل کائنات پر نظر کی گئی ہو۔ بہر حال خدا، روح، روحانیت اور فوق

الطبیعت کے خلاف ایک تعصب پیدا ہو گیا جو عقل واستدلال کا نتیجہ نہ تھا بلکہ سراسر جذبات کی انگیختگی کا نتیجہ تھا، وہ خدا سے اس لئے بیزار تھے کہ وہ ان کی آزادخیالی کے دشمنوں کا معبود تھا، ورنہ وہ خدا سے اس لئے تبری نہ کرتے تھے کہ دلائل وبرہان سے اس کا عدم وجود اور عدم وجوب ثابت ہو گیا تھا، بعد کی پانچ صدیوں میں ان کی عقل وفکر اور ان کی جدوجہد نے جتنا کام کیا، اس کی بنیاد یہی غیر عقلی جذبہ تھا۔"[1]

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

---

[1] انسان، مادہ پرستی اور اسلام، ص ۵۴.

باب سوم:

فصل اول:

دین داری اور بے دینی کے لحاظ سے معاشرے کا جائزہ، اسباب وعوامل

انسانی معاشرہ اس وقت دین ومذہب کے لحاظ سے دو جماعتوں میں تقسیم ہے، ایک جماعت ان لوگوں کی ہے جو کسی نہ کسی دین ومذہب کے پیروکار ہیں اور اس کی ضرورت محسوس کرتے ہیں جبکہ دوسری قسم ان بے نصیب لوگوں کی ہے جو دین ومذہب نامی کسی چیز کی ضرورت محسوس نہیں کرتے اور عملی طور پر بھی وہ کسی دین کے ساتھ اپنا رشتہ نہیں جوڑتے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اللہ تعالیٰ کے وجود ہی کے قائل نہیں ہیں جن کو دہری کہاجاتا ہے۔ پھر پہلی جماعت کی بیسیوں شاخیں ہیں (جو کسی نہ کسی سے اپنا تعلق جوڑتے ہیں)، چنانچہ دنیا میں بہت سے مذاہب وادیان رائج ہیں اور ہر دین کے کچھ نہ کچھ پیروکار ہوتے ہی ہیں، اس لئے مذاہب کی تعداد کے مطابق اس جماعت کی شاخیں ہیں۔

لیکن اسلامی نقطہ نظر سے دیکھاجائے تو بنیادی طور پر انسانیت دو قسموں میں بٹی ہوئی ہے: ایک قسم اہل حق کی ہے جو اہل اسلام سے عبارت ہے اور ایک قسم اہل باطل کی ہے جن کو غیر مسلم اور کافر بھی کہاجاتا ہے، اس دوسری قسم میں دیگر مذاہب وادیان کے معتقدین بھی داخل ہوجاتے ہیں اور وہ لوگ بھی جن کو دہری یا ملحد کہاجاتا ہے۔ "دیکی پیڈیا"[1] کے تجزیہ کے مطابق مذاہب کے لحاظ سے دنیا کا حال درج ذیل ہے:

---

[1] یاد رہے کہ "دیکی پیڈیا" کوئی یقینی وموثوق ذریعہ نہیں ہے اس لئے اس کی ہر بات کو درست تسلیم کرنا ضروری نہیں ہے بلکہ اہل تحقیق کے لئے تحقیق کے دروازے کھلے ہیں، البتہ یہاں صرف ایک اندازہ لگانے کے لئے یہ رپورٹ نقل کی گئی۔

مذاہب	پیروکار	دنیا کی آبادی کا فیصد
عالمی آبادی	۶٫۹ بلین	
عیسائیت	۲۲۳۳۱۵۰۹۰۰۰۰	٪۳۴
اسلام	۱۶۱۹۳۱۴۰۰۰	٪۲۳
بے دین	۱۱۰۰۰۰۰۰۰۰	٪۱۶
ہندومت	۱۰۸۳۸۰۰۳۵۸	٪۱۵
بدھ مت	۶۹۰۸۴۷۲۱۴	٪۱۰
مجموعہ	۸.۶ بلین	٪۹۸

اس رپورٹ کے مطابق دنیا جہاں میں صرف ۲۳ فیصد افراد ہی ہیں جو بنیادی دین ومذہب کے لحاظ سے حق پر ہیں اور ۷۷ فیصد لوگ کافر وغیر مسلم ہیں جن کی گمراہی میں کسی شبہ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

اس کے بعد اسلام کے عنوان کے تحت اس وقت جو لوگ داخل سمجھتے جاتے ہیں، ان کے باہمی اختلافات کی وجہ سے دسیوں فرقے اور جماعتیں وجود میں آچکی ہیں اور ان میں سے متعدد فرقے ایسے ہیں جو دین اسلام کے بنیادی عقائد ونظریات ہی کے قائل نہیں ہیں اس لئے اکثر مسلمانوں کے نزدیک ایسی جماعتیں مسلمان ہی نہیں ہیں، مثال کے طور پر:

الف: قادیانی گروہ: یہ وہ لوگ ہے جو حضور نبی اکرم ﷺ کے بعد بھی اس بات کو جائز سمجھتے ہیں کہ کسی شخص کو نبوت ملے اور اسی بناء پر وہ مرزا غلام احمد قادیانی کو (معاذ

اللہ) نبی سمجھتے ہیں۔ حالانکہ حضور نبی کریم ﷺ کا آخری نبی ہونا اور نبوت کا آپ ﷺ پر بالکل تمام و کمال ہونا ان بنیادی اور ضروری عقائد میں سے ایک ہے جو قرآن وحدیث کے سینکڑوں نصوص میں وضاحت کے ساتھ بیان ہوا ہے اور جن کا انکار کرنا یا اس میں غیر ضروری کھینچ تھان کرنا کفر ہے۔ اس لئے مسلمانوں کے نزدیک ان کے کافر ہونے میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔

ب: منکرین حدیث: یہ وہ لوگ ہیں جو حضور ﷺ کے احادیث کو حجت نہیں مانتے اور اس کو دین وشریعت کا مصدر تسلیم نہیں کرتے، چنانچہ ان کے لئے حضور نبی اکرم ﷺ کا قول وفعل کسی خاص دلچسپی کا باعث نہیں ہے بلکہ قرآن کریم ہی ان کا واحد "دینی مصدر" ہے اور جو چیز اس میں نہیں ہے وہ دین کی طرف منسوب نہیں ہوسکتی۔ جبکہ حضور ﷺ کی اطاعت اور آپ کی سنت کی حجیت قطعی نصوص سے ثابت ہے، خود قرآن کریم نے بارہا اس کا حکم دیا۔ سنت وحدیث کو حجت نہ ماننے سے دین اسلام کی بنیاد ہی منہدم ہو جاتی ہے۔ اس لئے ان کے کافر ہونے میں بھی کوئی شبہ نہیں ہے۔

ج: ذکری فرقہ: جو اپنے زعم کے مطابق ذکر الہی پر ہی اپنا زور صرف کرتے ہیں اور نماز وغیرہ کو بھی کوئی خاص اہمیت نہیں دیتے۔

د: آغاخانی گروہ: جو اپنے پیشوا آغاخان کے متعلق غلو آمیز خیالات واعتقادات رکھتے ہیں اور بہت سے قطعی دینی احکام کا انکار کرتے ہیں۔ ان دونوں جماعتوں کے کافر ہونے پر بھی امت متفق ہے اور اس حوالہ سے ان کے درمیان کوئی قابل ذکر اختلاف موجود نہیں ہے۔

ر۔ شیعہ: یہ مختلف گروہوں کے اندر بٹی ہوئی ایک گمراہ جماعت ہے، ان کے بہت سے ذیلی فرقوں کے بعض ایسے اعتقادات ہیں جو قطعی نصوص سے ٹکراتے ہیں۔ مثال کے طور پر قرآن کریم میں تحریف کا خیال، حضرت سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا پر بدکاری کی تہمت لگانا، حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اصل نبی سمجھنا، یا اپنے "اماموں" کو نبوت کے درجہ کے مساوی یا اس سے افضل تصور کرنا، وغیرہ۔ ان جماعتوں کے کافر ہونے میں بھی تامل کرنے کی ضرورت نہیں ہے، البتہ اگر کہیں کوئی ایسا شیعہ بھی ہو جو تمام ضروریات دین کا قائل و معتقد ہو اور ان جیسے تمام کفریہ عقائد و نظریات سے اپنی براءت کرتا ہو، تو وہ کافر نہیں کہلائے گا۔

یہ تو صرف ان فرقوں کا ذکر ہے جن کو آج کل عام دنیا میں مسلمان کہا جاتا ہے لیکن در حقیقت وہ مسلمان نہیں ہیں بلکہ کافر ہے۔ اور ان میں بھی صرف روایتی فرقوں کا ذکر ہے جو خود کو ایک مخصوص مسلک یا مذہب کے طور پر متعارف کرتے ہیں یا کم از کم عام لوگوں نے ان کو ایک خاص نام دیا ہے۔ اس کے علاوہ جو فرقے مجموعی طور پر کوئی کفریہ اعتقاد نہیں رکھتے اور اسی طرح بعض کفریہ نظریات و اعمال جن کے حاملین روایتی جماعتوں کی طرح کسی خاص گروہ کے طور پر اپنی امتیازی شناخت نہیں رکھتے، وہ اس کے علاوہ ہیں۔ ان تمام گمراہ جماعتوں کا اگر جائزہ لیا جائے تو ۲۳ فیصد سے تعداد بہت گھٹ جائے گی۔ اس کے بعد جو افراد باقی بچ جاتے ہیں وہ اہل سنت والجماعت کہلاتے ہیں، اور نظریاتی اعتقادی لحاظ سے یہ لوگ صحیح معنیٰ میں اہل حق کہلانے کے مستحق ہیں۔

لیکن چونکہ دین اسلام صرف چند نظریات و اعتقادات ہی سے عبارت نہیں ہے بلکہ ایک جامع نظامِ زندگی ہے جیسا کہ اسی کتاب کے باب دوم میں تفصیل سے ذکر کیا گیا ہے،

اس لئے صرف اعتقادات کی درستگی مکمل دین نہیں ہے اور محض درست اعتقادات کا حامل شخص کامل دین دار نہیں کہلاتا، بلکہ اس کے لئے ضروری ہے کہ دین حق کے باقی احکام وہدایات پر بھی عمل کرے جس کی وضاحت باب دوم میں دین کے شعبوں کے ضمن میں ذکر کی گئی ہے اور ان شعبوں کے لحاظ سے اسلامی معاشرے کا کیا رویہ ہے ؟ کس حد تک مسلمان اس پر عمل کرتے ہیں، ایک محتاط اندازے کے مطابق اس کی موٹی موٹی تفصیل درج ذیل ہے:

عبادات سے متعلق امت کا تعامل

ایسے لوگ جو چاروں عبادات کو پابندی کے ساتھ انجام دیتے ہوں، وہ بہت کم ہیں۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق جو لوگ پانچ وقت کے نمازی ہیں، ان کا تناسب پانچ تا دس فیصد ہے، باقی نوے فیصد مسلمان وہ ہیں جو مسلمان ہونے کے باوجود بھی پنج وقتہ نمازی نہیں ہیں۔ یہ تو صرف نماز کا حال ہے، نماز کے ساتھ باقی تینوں عبادات انجام دینے کی تعداد اس سے بھی کم ہے۔ پھر جو لوگ ان چاروں عبادات کے پابند ہیں، ان میں بھی ایک خاصی کثیر تعداد ایسے لوگوں کی ہے جو عبادت کرتے تو ہیں لیکن اس کی بعض شرائط وواجبات وغیرہ سے غافل ہوتے ہیں یا بعض ایسی چیزوں سے ناواقف ہوتے ہیں جن سے عبادت شریعت کی نظر میں معتبر قرار نہیں پاتی، اس لئے وہ یوں ہی ناتمام عبادات سرانجام دیتے رہتے ہیں۔ اس کے بعد جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ چاروں عبادات کو صحیح طریقے سے پابندی کے ساتھ ادا کرنے کی توفیق نصیب فرماتے ہیں، ان کی عبادات میں بھی قبولیت کی شرائط مکمل پائی جاتی ہیں یا نہیں؟ اس کو دیکھا جائے تو معاملہ افسوسناک حد تک پہنچ جاتا ہے۔

معاملات کے بارے میں رویہ

باب دوم میں معاملات کا مفہوم اور اس کی مختلف قسمیں ذکر کی گئیں، اس کی طرف ایک بار پھر مراجعت کرنا مفید ہے۔ معاملات کے ان تمام ابواب کا یہ حال ہے کہ تجارت کے دو چار مسائل اور نکاح کے ایک آدھ مسئلے کے علاوہ باقی ابواب تو اکثریت کے نزدیک گویا دین کا حصہ شمار نہیں ہوتے تھے، اب تو مجموعی طور پر یہ صورت حال ان شاء اللہ نہیں رہی اور اسلام کے بعض خدام کی محنتوں سے یہ شعور کم ہوتا محسوس ہوتا ہے لیکن عملی طور پر معاملات کے تمام ابواب کے متعلق مسلمان معاشرے کا تعامل دیکھا جائے تو مشکل سے دس فیصد سے زیادہ لوگ ایسے ہوں گے جو ان تمام ابواب میں دینی احکام پر عمل پیرا ہوں گے اور ہر طرح مادی مفادات کے مقابلے میں دینی حکم وہدایت پر عمل کرتے ہوں گے۔

معاملات کا ایک باب حکومت وامارت بھی ہے جس کو آج کل سیاسیات کے نام سے جانا جاتا ہے کہ حاکم کون ہوگا؟ کس طرح حاکم بنے گا؟ اور نظام حکومت کیا ہوگی؟ مقصدِ حکومت کیا ہوگا؟ وغیرہ۔ یہ تو ایسا باب ہے جو ایک طویل عرصہ ہوا کہ پوری امت میں بالکل عنقاء ہے، تاہم اب اللہ تعالیٰ کے بہت ہی فضل وکرم سے افغانستان مین اس کا سورج طلوع ہونے کو ہے، اللہ تعالیٰ اس کو نہایت استحکام وترقی سے نوازے۔ (آمین)

اخلاقیات کے متعلق عملی برتاؤ

یہ تو دین اسلام کا وہ باب ہے جو ایک طرف اگر غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے تو اس کے ساتھ بہت نادر وکمیاب بھی ہے، اس پر عمل کرنا گو بڑا خوشنما، خوشگوار اور نتیجہ خیز ثابت ہوتا ہے لیکن اس کا خوگر ہونا جی وجان پر اتنا ہی زیادہ گھٹن ومشکل ہوتا ہے۔ ظاہری طور پر ہنس مکھ چہرے سے ملنا، اور کسی وجہ سے دو چار میٹھی باتیں کرنا تو بلاشبہ کوئی مشکل

بھی نہیں ہے اور عملی طور پر کچھ کم بھی نہیں ہے لیکن شریعت کی نظر میں محض اتنا کرنا اخلاق حسنہ نہیں ہے اور صرف اتنا کرنے سے اخلاقیات سے متعلق تعلیمات پر عمل مکمل نہیں ہو جاتا۔ اخلاقیات کے باب میں شرعی ہدایات پر عمل کرنے والے افراد کا تناسب کتنا ہے؟ اگر اس کے متعلق انصاف اور دیانت داری کے ساتھ جائزہ لیا جائے تو شاید دو تین فیصد سے زیادہ نہ ہو۔

اسلامی آداب و معاشرت اور امت کی روش

یہ تو دین اسلام کے ان ابواب میں سے ہے جو ابھی تک اکثریت کے ہاں دین کا حصہ نہیں ہے، اس لئے اس پر عمل کرنے کا تناسب تو سب سے کم ہے۔ غرض عبادات کا باب دین و مذہب کا علامتی نشان و امتیازی شان ہوتا ہے، اس لئے اس کی طرف رغبت بھی زیادہ ہوتی ہے اور اس کا اہتمام بھی زیادہ کیا جاتا ہے اور اس باب کا حال بھی وہی ہے جو اوپر کے باب کے متعلق درج کیا گیا ہے تو دیگر ابواب کے عمل کرنے کا تناسب اس سے کم ہی ہے۔

حاصل کلام

یہاں تک اس بات کا جائزہ لیا گیا کہ روئے زمین پر اسلامی احکام و ہدایات پر عمل کرنے اور نہ کرنے کا تناسب کیا ہے؟ کتنے احکام و تعلیمات پر کتنے لوگ عمل کرتے ہیں؟ اور دین حق کا کتنا حصہ ہے جو جزوی یا کلی طور پر متروک و مہجور ہے، مختلف ابواب کے لحاظ سے اس کا ایک اندازے کے مطابق جائزہ لیا گیا۔ ایسی ہی صورت حال کو دیکھ کر بہت سے دینی درد رکھنے والے افراد کا کہنا یہ ہے کہ روئے زمین پر ایک بالشت زمین بھی ایسی نہیں ہے جہاں خدا تعالیٰ کا مکمل دین نافذ ہے۔ اگر کہیں کوئی فرد / گھرانہ یا ادارہ دین دار ہے تو اجتماعی و ملکی نظام دینی احکام کے مطابق نہیں ہے۔

مسلمانی کے باوجود گناہ کیوں؟

یہاں یہ سوال اٹھانا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ جو لوگ سرے سے بے دین ہے اور کسی دین کے قائل نہیں ہے یا کسی دین کی حامی تو بھرتے ہیں لیکن ہے بد دین، یعنی دین اسلام کے علاوہ کسی اور دین و مذہب کے پیروکار، ایسے لوگ تو جو چاہے کریں، لیکن جو لوگ اسلام کو حق سچ جانتے ہیں اور دین اسلام کو دل و جان سے قبول کر لیتے ہیں تو وہ دلی تصدیق واعتماد کے بعد بھی دینی احکام پر عمل کرنے سے کیوں اس قدر دور ہیں؟ کیا دینی حکم کو دل سے سچ نہیں جانا بلکہ اوپر اوپر سے تصدیق کی؟ اگر نہیں اور یقیناً نہیں ہے تو آخر کیا وجہ ہے کہ اتنی بڑی تعداد ایک چیز کو حق جاننے اور ماننے کے باوجود بھی اس کے مطابق چلنے کے لئے تیار نہیں ہیں؟

بے دینی کی دو بنیادی وجوہات: جہالت اور نفسانیت

جواب یہ ہے کہ ایسا کبھی تو جہالت اور ناواقفیت کی بنیاد پر ہوتا ہے اور بسا اوقات جان بوجھ کر۔ جہالت کا مطلب یہ ہے کہ عمل کرنے والے کو شرعی حکم کا علم ہی نہیں ہوتا کہ یہ فرض و واجب یا حرام و ممنوع ہے اور اسی جہالت کی وجہ سے وہ شرعی حکم کی خلاف ورزی کر گزرتا ہے۔ اور جان بوجھ کر گناہ کرنے کی صورت یہ ہے کہ حکم کا علم تو ہوتا ہے کہ اس معاملہ میں شریعت فلاں فلاں بات کی رہنمائی کرتی ہے لیکن اس کے باوجود وہ اس کے خلاف قدم اٹھاتا ہے۔ ایسا شخص شریعت کا استخفاف کرتا ہے اور نہ ہی شریعت کے حکم کا انکار مقصود ہوتا ہے لیکن کسی دنیوی مفاد و لالچ کی خاطر ایسی جسارت کر بیٹھتا ہے، اس کو "اتباع ہویٰ" یعنی (ناجائز) خواہشات کی پیروی کرنا کہا گیا ہے۔

فساد کا اصل سرچشمہ

مزید دقت سے کام لیا جائے تو واضح ہوتا ہے کہ اس کا باعث بھی جہالت ہی ہے چنانچہ بسا اوقات تو زبان حکم سے واقف ہوتی ہے لیکن دل و دماغ اس سے جاہل ہوتے ہیں اور کبھی تو دل کو ایک حد تک بات پہنچ جاتی ہے لیکن دل میں اس کی اہمیت و قدردانی نہیں ہوتی، چنانچہ دل اس بات سے ناواقف ہوتا ہے کہ دنیوی مفاد کے مقابلے میں اس کی اہمیت زیادہ ہے اور اس پر مرتب ہونے والے فوائد اس دنیوی مفادات کی بنسبت زیادہ سود مند اور فائدہ مند ہے۔

اس جہالت کی سب سے خطرناک، اندوہناک شکل یہ ہے کہ حکم پر عمل بھی نہ رہے اور اس کا احساس بھی رخصت ہو جائے، اس کا علاج بڑا مشکل ہے اور انجام نہایت خطرناک ہے اور نہایت افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ دور حاضر میں یہی مرض عام ہے۔ علامہ اقبال مرحوم نے بہت خوب فرمایا:

وائے ناکامی متاعِ کارواں جاتا رہا　　کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا

حاصل یہ ہوا کہ جہالت اور ناواقفیت ہی وہ بنیادی عنصر ہے جس کی وجہ سے مسلمان ہونے کے باوجود لوگ عملی طور پر اسلام کے احکام وہدایات سے دور ہوتے ہیں، البتہ یہ جہالت کبھی تو عام متبادر شکل میں ہوتی ہے کہ شرعی حکم کا علم ہی نہیں ہوتا اور کبھی اس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ حکم کا پتہ تو ہوتا ہے لیکن دل میں اس کی اہمیت اور قدردانی نہیں ہوتی اور اسی لئے دنیوی فوائد کو اس کی بنسبت زیادہ اہم خیال کیا جانے لگتا ہے۔

شیخ سعید رمضان بوطی کی تحقیق

شیخ سعید رمضان بوطی، اسلام کا پہلا دشمن کون؟ کا عنوان قائم کر کے، لکھتے ہیں:

الجهل بالاسلام هو مصدر كل عدواة له.ذلك لأنّ الجهل به يبرزه في مظهر جملة من القيود التي لا موجب لها.وبتعبير أخر: يجعله يبدو في أعين الجاهلين به، وكأنّه مجموعة سدود تقف في وجه الصالح والرغبات.إذن، فأكثر الناس جهلا بالاسلام، أشدهم عدواة له.

ترجمہ:"اسلام سے ناواقفیت ہی اس کی دشمنی کا بڑا ذریعہ ہے، کیونکہ اسلام سے ناواقفیت ہی اس دین حق کو غیر ضروری پابندیوں کی شکل میں دکھائی دیتی ہے۔ بالفاظ دیگر یہ دشمنی اسلام کو جہلاء کی نظر میں ترقی اور دلی چاہتوں کے سامنے مضبوط رکاوٹوں کی شکل میں ظاہر کرتی ہے۔ چنانچہ جو اسلام سے زیادہ ناواقف ہوتا ہے وہ اسلام کا بڑا دشمن ہوتا ہے"۔

اس کے بعد اس غلط فہمی کو دو کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ دین سے ناواقفیت کا شکوہ صرف غیر مسلم اقوام وافراد سے نہیں ہے بلکہ خود مسلمان برادری سے بھی یہی گلہ ہے، وہ مسلمان ہوتے ہوئے بھی اپنی دین وایمان کی تعلیمات سے بری طرح ناواقف ہیں، لکھتے ہیں:

وربما انطبق هذا على كثير من المسلمين أنفسهم ..فالمسلم الذي لم يكن له خيار في انتمائه إلى هذا الدين إلّا ما يساوي خياره في الميراث الذي وصله،دون قرار منه،من آبائه وأجداده،أي فلم يعلم من إسلامه هذا إلّا انّه الحظ الذي وصل اليه من الآباء والاجداد- أقول: هذا المسلم جدير به ان يضيق ذرعا بكل ما يبلغه عنه من

مبادئ واحكام ، لاسيما وان رغائبه وأحلامه تجمع به الي نقيض كثير منها.

ترجمہ: "یہ بات بہت مسلمانوں پر بھی منطبق ہوسکتی ہے، کیونکہ جن مسلمانوں کااسلام سے بس اتنا تعلق ہے جتنا آباءواجداد سے انہیں مشقت کے بغیر ملے میراث کاہوتا ہے۔چنانچہ وہ اسلام کے بارے میں صرف اتنا جانتا ہے کہ آباواجداد سے اسے یہ بھی ایک چیز منتقل ہوئی ہے۔تووہ مسلمان اس لائق ہے کہ اسے اسلامی احکامات اور تعلیمات میں جو حکم بھی ملے وہ اسے باعث مشقت سمجھے خاص کر جب وہ اسکے خواہشات اور مرضی کے خلاف ہو"۔

اس کے بعد بڑے کام کی بات ذکر کرتے ہیں کہ دین اسلام کے خلاف یلغار کا بنیادی سبب بھی یہی اسلام سے ناواقفیت ہی ہے، جھوٹے افواہوں اور پروپیگنڈوں کی وجہ سے اس معصوم دین متین کو بے حد داغدار دکھایا جاتا ہے جس کی وجہ سے یورش پیدا ہوجاتی ہے، لکھتے ہیں:

إنّ الجهل بالاسلام هو الفرصة الوحيدة لانتقاصه والهجوم عليه،وهو الناخ الوحيد الذي تستنبت فيه الأكاذيب التي تتنامي في هذا المناخ وتلتصق بالإسلام خلال غيبوبة المسلمين أو أكثرهم عن الإسلام هم بحاجز الجهل بحقيقته،هي التي تخلق عوامل الاشمئزاز منه والعدواة له[1].

---

[1] الأسلام والغرب، من"هو العدوّ الأول للإسلام اليوم؟ ص۹۹

ترجمہ: "اسلام سے ناواقفیت ہی شرعی احکام کی حق تلفی، اس کے خلاف محاذ آرائی کا سبب ہے، یہ وہ آب وہوا ہے جس میں جھوٹ کاپودا پیدا ہوکر اسی ماحول میں پروان چڑھتا ہے اور پھر مسلمانوں کا اسلام سے غفلت کی وجہ سے اسلام کے دامن میں جاگرتا ہے۔ مسلمان حقیقت اسلام سے ناواقف ہیں اور یہی وجہ ہے کہ وہ اسلام سے اپنی دامن کھینچ کر اس کے دشمن بن جاتے ہیں"۔

مرض کی دواء

مرض کی تشخیص ہو جانے کے بعد اس کا علاج جاننا کوئی مشکل نہیں ہوتا، اور وہ یہی ہے کہ علوم دینیہ عام کئے جائے اور مذہبی حس وشعور کو خوب اجاگر کر دیا جائے، صرف دینی معلومات عام کرنے سے یہ کام پورا نہیں ہوگا بلکہ ساتھ ساتھ دل کی دنیا میں اس کو پیوست کرنے کی بھی پوری پوری کوشش کرنی ضروری ہے۔ البتہ ضروری نہیں ہے کہ علاج کارگر ثابت ہو اور ضرور مریض اس کی برکت سے شفاء یاب ہی ہو جائے اور علاج کا نتیجہ خیز نہ دکھائی دینا مایوسی، حوصلہ شکنی یا بے ہمتی کا موجب نہیں ہوتا بلکہ یہ تو اس بات کا متقاضی ہے کہ تسلسل اور فکر مندی کے ساتھ اس کو بر قرار رکھا جائے۔

موجودہ بے دینی اور دینی ناواقفیت کا ایک بنیادی سبب

یہاں یہ سوال بھی ہو سکتا ہے کہ جس طرح اسلام اور مسلمانی کے باوجود معاشرے میں گناہوں کا غالب ہونا اور دین بے زاری کا عام ہونا تعجب امیز امر ہے، یوں ہی اس کا جو سبب بتایا گیا ہے یعنی دین سیکھنے سے غفلت اور دینی تعلیمات سے جہالت وناواقفیت ، یہ بھی باعث حیرت ہے کہ کسی چیز کو حق سچ سمجھنے اور معیار حق تسلیم کرنے کے بعد اس کا

کیا تھک رہ جاتا ہے کہ آدمی اس کے ضروری تعلیمات سیکھنے کی زحمت ہی گوارانہ کرے!
اس لئے وہ پہلا سوال بھی اپنی جگہ کسی حد تک بر قرار رہتا ہے کہ دین دار ہونے اور ایمان وتصدیق بجالانے کے بعد بھی ایک مسلمان کیوں کر دینی ضروری احکام کی طرف پشت کر سکتا ہے؟ جہنم وجنت، اللہ تعالٰی کی ذات وصفات پر یقین کے بعد یہ کہاں متصور ہو سکتا ہے کہ دینی فرائض وواجبات میں کوتاہی کرے یا معاصی ومنکرات کا ارتکاب کرتا پھرے؟ جب سو فیصد یقین ہے کہ دنیا فانی اور ناقص ہے جس کے بعد قبر، حشر، حساب وکتاب کے کٹھن مراحل سے گزرنا ہو گا، اس کی بجائے آخرت کی نعمتیں کامل اور باقی ہیں تو ان باتوں کو دل وجان سے مان لینے کے بعد یہ کیسے باور کیا جاسکتا ہے کہ پھر بھی کوئی شخص بے دینی اور دین بے زاری کے رخ پر ہی چلتا رہے؟ ہمارا معاشرہ بحمد اللہ مسلمان ہیں اور اس کے باشندے بڑے فخر، محبت اور عقیدت کے ساتھ اپنے مسلمان ہونے کا اظہار واعتراف کرتے ہیں تو پھر کیوں اجتماعی طور پر دین واسلام کے آثار نظر نہیں آتے!

ان باتوں کا تحقیقی جواب یہ ہے کہ دین اسلام کے بہت سے رقیب ہیں جو دین کے احکام وتقاضوں پر چلنے سے رکاوٹ بنتے ہیں، ان میں سے بڑا اور ایک بنیادی نوعیت کا رقیب " دنیاویت " اور " مادیت " ہے، دیگر تمام یا اکثر رقیب بھی اسی کے ساتھ جڑے ہوئے ہیں۔ دور حاضر کا بڑا المیہ اگر کوئی ہے تو وہ یہ ہے کہ یہ رقیب خوب پروان چڑھ رہا ہے، اس کے رواج پانے، پھلنے اور بڑھنے کے تمام تر اسباب ووسائل کی بہتات ہے، انفرادی اور اجتماعی ہر سطح پر اس کا طوفان ہے جس کی وجہ سے امت مرحومہ کے بہت سے نونہال افراد اس کے دام میں پھنس کر رہ جاتے ہیں، رفتہ رفتہ یہی چیز ان کے دل ودماغ پر قابو یافتہ ہو جاتی ہے اور جب ایک رقیب اچھی طرح قدرت واستحکام پالیتا ہے تو ظاہر ہے کہ

اس کے بعد دوسرے رقیب کے لئے عزت ورفعت کی کوئی جگہ برقرار نہیں رہتی بلکہ دادر ورسن ہی اس کا مقدر بن جاتا ہے۔

مادیت کا اثر: دینی احساس کا مرنا

اسی کا نتیجہ ہے کہ اسلام کا کلمہ پڑھنے، دین کا طوق گلے پہننے، اور اسلام و مسلمان ہونے کے اعتراف کے باوجود اسلام ان کے دل ودماغ پر اس طرح حاوی نہیں ہوتا جس قدر اس کا حق ہے۔ اسلام کی رفعت کا تقاضا تو یہ تھا کہ اس کے لئے جان ومال اور عزت وآبرو غرض ہر چیز کی قربانی دی جائے، کسی دینی حکم کی تعمیل میں اگر ان چیزوں میں سے کوئی رکاوٹ پیش آجائے تو اس کو رکاوٹ نہ بننے دے بلکہ بڑی پیار ومحبت سے اس کو چھوڑ کر اصل دینی حکم پر عمل کیا جائے لیکن مادیت جب دل میں رچ بس جاتی ہے تو اس کے بعد یہ تاثر ختم ہو جاتا ہے، اس کے بعد دینی سوچ اور مذہبی مزاج ومذاق اگر کہیں برقرار بھی رہے تو وہ نہ کماحقہ راسخ ہوتا ہے اور نہ پائیداری اس کو نصیب ہوسکتی ہے، تاہم دل ودماغ اس کو مکمل اور پائیدار دکھانے کی فکر میں برابر رہتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان دھوکہ میں رہتا ہے اور دھوکہ بھی ایسا جس کا احساس تک بھی نہیں رہتا، ع:

وائے ناکامی متاع کارواں جاتا رہا   کارواں کے دل سے احساس زیاں جاتا رہا

اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ: "فلسطین میں یہودیوں اور عربوں کے درمیان جھگڑے ہوئے، اس پر دنیا بھر کے یہودیوں نے فلسطین کے یہودیوں کے لئے چندہ جمع کرنا شروع کیا اور دس لاکھ پونڈ جمع کر کے بھیجے، مسلمانان عالم نے بھی فلسطین کے

مسلمانوں کے لئے چندہ جمع کیا، لیکن بڑی کوشش کے باوجود تیرہ ہزار پونڈ جمع ہوئے یعنی وہی سو اور ایک کی نسبت۔"[1]

قرآن کریم کے چند اشارات

قرآن وحدیث میں ایک دو جگہ نہیں بلکہ بیسیوں جگہ مختلف اسالیب اور متعدد انداز میں اس بات پر زور دیا گیا ہے، ایک جگہ ارشاد خداوندی ہے:

﴿ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّ وَعْدَ اللَّهِ حَقٌّ فَلَا تَغُرَّنَّكُمُ الْحَيَاةُ الدُّنْيَا وَلَا يَغُرَّنَّكُمْ بِاللَّهِ الْغَرُورُ (٥) إِنَّ الشَّيْطَانَ لَكُمْ عَدُوٌّ فَاتَّخِذُوهُ عَدُوًّا إِنَّمَا يَدْعُو حِزْبَهُ لِيَكُونُوا مِنْ أَصْحَابِ السَّعِيرِ (٦) الَّذِينَ كَفَرُوا لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيدٌ وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَهُمْ مَغْفِرَةٌ وَأَجْرٌ كَبِيرٌ (٧) أَفَمَنْ زُيِّنَ لَهُ سُوءُ عَمَلِهِ فَرَآهُ حَسَنًا فَإِنَّ اللَّهَ يُضِلُّ مَنْ يَشَاءُ وَيَهْدِي مَنْ يَشَاءُ فَلَا تَذْهَبْ نَفْسُكَ عَلَيْهِمْ حَسَرَاتٍ إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ بِمَا يَصْنَعُونَ ﴾ [فاطر: ٥ – ٨]

ترجمہ: " اے لوگو: بیشک اللہ کا وعدہ سچا ہے پھر تمہیں دنیا کی زندگی دھوکے میں نہ ڈالے اور تمہیں اللہ کے بارے میں دھوکہ باز دھوکا نہ دے۔ بیشک شیطان تو تمہارا دشمن ہے سو تم بھی اسے دشمن سمجھو وہ تو اپنی جماعت کو بلاتا ہے تاکہ وہ دوزخیوں میں سے ہو جائیں۔ جن لوگوں نے انکار کیا ان کے لیے سخت عذاب ہے اور جو ایمان لائے اور نیک عمل کیے انہیں کے لیے بخشش اور

---

[1] اسباب زوال امت، ص ۱۰۲۔ از جناب شکیب ارسلان صاحب مرحوم۔

بڑا اجر ہے۔ بھلا جس کے برے کام بھلے کر دکھائے ہوں پھر وہ ان کو اچھا بھی
جانتا ہو (نیک کے برابر ہو سکتا ہے) پھر اللہ جس کو چاہتا ہے گمراہ کرتا ہے اور
جسے چاہتا ہے ہدایت کرتا ہے پھر آپ ان پر افسوس کھا کھا کر ہلاک نہ ہو جائیں
کیونکہ اللہ خوب جانتا ہے جو وہ کر رہے ہیں۔"

ان آیات سے واضح ہوتا ہے کہ:

الف: دنیوی زندگی میں انہماک انسان کو دھوکہ دیتا ہے اور وہ دھوکہ یہی ہے کہ مقصود سے غافل ہو جاتا ہے اور ساری صلاحیتیں اسی دنیا کے ماتھے پر قربان کر دیتا ہے، دینی لحاظ سے اس پر جو ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں، ان کی طرف اس کو یا تو بالکل ہی خیال والتفات نہیں ہوتا یا اگر ہوتا بھی ہے تو وہ اس درجے کا نہیں ہوتا جس درجے کا التفات خود دین کا تقاضا ہے۔

ب: اس طرف بھی اشارہ ہو جاتا ہے کہ دنیا کے اس سیلاب میں بہہ جانے اور اس کے بل بوتے دھوکہ کھانے کا بنیادی سبب یہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے وعدوں پر یقین میں کمزوری پیدا ہو جاتی ہے یا اس طرف توجہ برقرار نہیں رہتی۔

ج: یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ بہت سے لوگ دھوکہ میں جا جا کر ایسے مقام پر پہنچ جاتے ہیں جہاں ان کو اپنی خرابیاں اور برے اعمال بھی خوب صورت اور منقش نظر آتے ہیں۔

مذہبی گرفت اور موجودہ معاشرہ

اس بات میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ بحالتِ موجودہ دینی گرفت اور مذہبی ڈھیل پہلے کی بنسبت بہت کمزور ہے اور اس بات سے بھی انکار کرنا درست نہیں ہے کہ کمزوری لحہ لحہ

زیادہ ہوتی جارہی ہے، چنانچہ اب عام مسلمان کہلانے والے معاشرے کا یہ حال ہے کہ خالص دینی ومذہبی جذبے کی بنیاد پر کوئی بڑی قربانی انجام دینا، اپنے مفاد کو اس پر نثار کرنے کا رواج عام بالکل نہ رہا، پہلے جس طرح حرام اور ناجائز کے الفاظ کسی بھی چیز کی روک تھام کے لئے کفایت کر جاتے تھے، اب وہ ماحول نہیں رہا بلکہ کفر وارتداد کے الفاظ میں بھی وہ قوت وزور نہ رہا جو کسی زمانے میں حرام کے لفظ میں تھا۔ کسی چیز پر ابھارنے کے لئے واجب اور فرض کا لفظ کسی زمانے میں بجلی کا سا کام کر گزرتا تھا، لیکن اب یہ حال ہے کہ عام مسلمان کے حق میں یہ الفاظ اس حد تک بھی مؤثر نہیں ہیں کہ ان کو اپنے غیر ضروری مشاغل سے اٹھا کر کسی فریضہ پر لائے۔ عام ذہنوں میں عزت وذلت، رفعت وپستی، خوش بخت وبد بخت، پسند وناپسند وغیرہ کا ترازو اب دین ومذہب اور اس کے اعمال وتعلیمات نہیں رہیں۔

یہ وہ کڑوی حقائق ہیں جن سے انکار کرنا اس شخص سے متصور نہیں ہے جو موجودہ عام معاشرے اور اس کے تصورات ومشاغل سے اچھی طرح خبردار ہو۔ دینی خدمت کے حس رکھنے والے افراد کے لئے جو بات ضروری اور نہایت ضروری ہے وہ یہ ہے کہ اس موجودہ بیماری کے اسباب کا کھوج لگائیں جو اس وقت وباء عام کی روپ دھار چکی ہے اور پھر ان اسباب کا کوئی معقول ومتوازن حل پیش کریں اور صرف نظریاتی طور پر حل پیش کرنا ہی کافی نہیں ہے بلکہ اپنی استطاعت کی حد تک اس کو عملی قالب میں ڈھالنا ضروری ہے۔

حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ایک موقع پر بڑی حکمت وبصیرت کی بات ارشاد فرمائی تھی، فرمایا تھا:

أَنتُم إِلَىٰ إِمَام فعال أحوج مِنكُم إِلَىٰ إِمَام قَوَّال[1]

یہاں اسی جذبے کے ساتھ گہرے غور و فکر کے بعد کچھ سطور تحریر کئے جاتے ہیں۔

مذہبی گرفت کے کمزور ہونے کے اسباب و عناصر

دین و مذہب کے حوالہ سے ہمارا موجودہ مسلمان معاشرہ انحطاط و بے قدری کے جس موڑ پر جا پہنچا ہے، یہ بے سبب نہیں ہے۔ اس دنیا میں حقیقی مدبر بلاشبہ اللہ تعالیٰ ہی ہے، وہی اس سارے جہاں اور اس کے ہونے والے تمام تر تصرفات و تبدیلیوں کا پیدا کرنے والا ہے، لیکن اس ہستی نے اس عالم کو "عالم اسباب" بنایا ہے جہاں جو کچھ ہوتا ہے اسباب کے دائرہ کے اندر ہوتا ہے، حالات اگر ایک رخ سے پلٹ کر دوسرے رخ کی طرف جاتے ہیں تو یہ بھی خود بخود نہیں ہوتا، بلکہ اس کے بھی مختلف اسباب ہوتے ہیں۔ اگر یہ تمام باتیں سچ ہیں اور حقیقت کے مطابق ہیں تو پھر کوئی وجہ نہیں ہے کہ دین کے لحاظ سے اس قدر غیر معمولی تبدیلی بے سبب اور بلا وجہ پیش آئی ہو۔ اب وہ اسباب و عناصر کیا ہیں جن کی وجہ سے نوبت یہاں تک پہنچی؟ کون سے عوامل ہیں جن کی وجہ سے دین اسلام جیسا گراں مایہ متاع جاں اس قدر بے وقعتی کا شکار ہوا؟

بنیادی عناصر کی تشخیص

اس کا جواب یہ ہے کہ ایسا متعدد اسباب کی وجہ سے ہوا جن میں سے بعض اسباب کا تعلق تو خود ابنائے اسلام کے ساتھ ہی ہے اور بعض عناصر ان لوگوں کی طرف سے وجود

---

[1] أدب المجالسة وحمد اللسان، ص: ۷۱.

میں آئے ہیں جو دین اسلام کی نعمت سے نہ صرف یہ کہ محروم تھے بلکہ اس کی دشمنی پر آمادہ اور اپنے زعم کے مطابق اس کی بیخ کنی میں مصروف رہے تھے۔

مسلمانوں کی کوتاہیاں

مسلمانوں کی طرف سے جو کوتاہی عمل میں آئی اور جس کی وجہ سے یہ صورت حال پیدا ہوئی، اس کو اگر کوئی اجمالی اور جامع عنوان دیا جائے تو وہ یہ ہے: "دین کے نظریاتی اور عملی حدود کی حفاظت میں کوتاہی"۔ کچھ اپنوں کی سادگی تھی اور کچھ غیروں کی عیاری وچالاکی تھی کہ دین اسلام کے نظریاتی دیواروں پر ضرب کاری لگتی رہی، مسموم ہوائیں اس کی در ودیوار سے ٹکراتی رہیں، ہر طرف سے اس پر طعن و تشنیع کے نیزے برستے رہیں اور یہ سب کچھ ایک دن یا خاص وقت تک محدود نہیں تھا بلکہ تسلسل اور تواتر کے ساتھ ایسا بہت کچھ مختلف شکلوں میں ہوتا رہا، لیکن اہل خانہ بالکل بے فکر و مطمئن رہے، ان کی طرف سے جس طرح اقدام یا دفاع ضروری تھا، وہ نہیں کیا جس کی وجہ سے دین اسلام کی نظریاتی بنیادوں میں دراڑیں پڑنا شروع ہوئی۔

دوسری طرف امت کی طرف سے اجتماعی سطح پر عملی میدان میں مختلف دینی کوتاہیاں ہوتی رہیں، انفرادی غلطی اگرچہ غلطی ہی ہے لیکن اس سے عام طور پر اجتماعی نقصان نہیں ہوتا، اس لئے اگر ایسی غلطیاں اپنی حدود کے اندر رہے تو اس کی وجہ سے ملک وملت کی تصویر نہیں بدلتی، لیکن اجتماعی غلطی اور قومی وملی جرم کا خمیازہ پوری قوم ہی کو بھگتنا پڑتا ہے، علامہ اقبال مرحوم نے سچ فرمایا ہے:

فطرت افراد سے اغماض بھی کر لیتی ہے   کرتی نہیں ملت کے گناہوں کو معاف

امت کی طرف سے جب اجتماعی طور پر دین اسلام کے متعلق کوتاہیاں سرزد ہونے لگی تو اس کا نقصان یہی ہوا کہ آئندہ آنے والے نسلوں کے ذہن میں دین کی وہ اہمیت و قدردانی باقی نہ رہی جو آباء واجداد کے دل و جگر میں راسخ تھی۔ اگر کسی ماحول میں سود و قمار کا رواج عام ہو اور اس کو گناہ و جرم گردانے بغیر لوگ ان جیسے معاملات کا لین دین کرتے ہوں اور اس ماحول میں کچھ افراد ایسے ہوں جو اصل دینی تعلیمات سے زیادہ واقفیت نہ رکھتے ہوں اور قرآن وسنت پر ان کی نظر نہ ہو تو ان کے دل ودماغ میں ان دونوں چیزوں کی حرمت و مذمت اس قدر شدید نہیں ہوگی جس قدر شریعت نے اس کی شدت فرمائی ہے۔

خادمانِ دین سے ایک درخواست

یوں تو حقیقت یہ ہے کہ جس شخص کو اس پر آشوب زمانے میں خلوص کے ساتھ دین کی خدمت کرنے کی توفیق نصیب ہو جائے، وہ بڑا خوش بخت انسان ہے جس کی دل وجان سے پوری قدر دانی کر لینی چاہئے، لیکن اس کے ساتھ ساتھ خدمت دین کے مجموعی کام میں رائج خامیوں کی نشاندہی کرنا اور پھر اس کے درست کرنے کی فکر کرتے رہنا بھی امت کی ذمہ داری ہے تا کہ اپنی حد تک ممکنہ غلطیوں کی تلافی کی جاسکے۔

اس تناظر میں خدام دین کی ایک بنیادی غلطی یہ دیکھنے میں آتی ہے کہ وہ لوگوں کو دین کی طرف لانے کی فکر تو کرتے ہیں اور دل سے چاہتے ہیں کہ غیر مسلم لوگ اسلام کے دائرے میں داخل ہو جائیں، گناہ گار مسلمان عدل و تقویٰ کے حصار میں آجائیں اور اس کے لئے عملی طور پر بھی کچھ نہ کچھ محنت کرتے رہتے ہیں لیکن جن لوگوں کو دینی حصار تک لانے اور داخل کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں، ان کو یہاں تک لے پہنچانے کے بعد بے

فکر ہو جاتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ ہم نے اپنی پوری ذمہ داری نبھائی۔ اس کے بعد جب وہ عرصہ بعد دیکھتے ہیں کہ جن لوگوں کو وہ دین یا عدل و تقویٰ کی طرف کھینچ لائے تھے ان کی زندگیوں میں کوئی دینی تبدیلی نہیں آئی یا وہ اپنی گمراہی کی طرف واپس پلٹ کر چلے گئے تو اس کو دیکھ کر وہ احساس کمتری کے شکار ہو جاتے ہیں اور اس کو حالات کے ظلم و ستم کی طرف منسوب کر کے خوب صاف ستھرے نکل جاتے ہیں۔ حالانکہ بات یہ ہے کہ جس طرح نیکی یا ایمان کی طرف دعوت دینا اور لوگوں کو راغب کرنا ایک دینی ذمہ داری ہے، یوں ہی آنے والوں لوگوں کی نظریاتی و عملی تربیت کا اہتمام کرنا بھی لازم ہے، ان کو ایسا ماحول مہیا کیا جائے جس میں رہ کر وہ دین کے ضروری مبادی و تعلیمات سے واقف ہو جائیں، اسلام کے موٹے موٹے احکام و شعائر کو وہ جان بھی لیں اور ان کے مطابق عملی ڈھانچہ بھی پیدا کرے، ایسا ماحول جس میں رہ کر وہ اپنے فیصلے پر پشیمان اور نادم نہ ہوں بلکہ اس کو واقعی سعادت، خوش بختی اور نعمت خداوندی سمجھ کر استقامت کے ساتھ اس پر کار بند رہے۔

اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ یہ تمام ذمہ داریاں ایک ہی شخص یا جماعت اپنائے بلکہ یہ امت کے کندھوں پر دین حق کی اجتماعی ذمہ داری ہے، یہ ملی بوجھ ہے جو کسی ایک شخص کے بس کی بات نہیں ہے بلکہ تقسیم کار کا ضابطہ ہی اس کے لیے مناسب ہے لیکن پوری امت اجتماعی طور پر جس طرح دیگر کاموں کو اپنی ذمہ داری سمجھتی ہے اور اس کا اہتمام کرتی ہے یوں ہی یہ بھی ایک اجتماعی ذمہ داری ہے اور اس کا بھی عملی طور پر اہتمام کرنا ضروری ہے۔

بیرونی اسباب

بیرونی اسباب سے مراد وہ عناصر وعوامل ہیں جو ان لوگوں کی طرف سے وجود میں آئے ہیں جو دین اسلام سے وابستہ نہیں ہے بلکہ اس عظیم نعمت ودولت سے محروم ہیں جن کو شریعت کی اصطلاح میں بجا طور پر "کفار" کہا جاتا ہے۔ ایسے لوگوں کی طرف سے بنیادی طور پر دو اسباب پائے گئے جن کی وجہ سے وہ خرابی پیدا ہوئی جس کا ذکر پہلے سطور میں کیا گیا ہے۔ ایک فوجی اور گرم جنگ اور دوسرا اقدام نظریاتی اور سرد جنگ ہے لیکن اس میں بھی بنیادی اہمیت اسی دوسری جنگ کو حاصل ہے چنانچہ فوج واسلحہ کے ذریعے گردنوں کو تہ تیغ تو کیا جاسکتا ہے اور زیر نگین بھی کر دیا جاسکتا ہے لیکن ناممکن ہے کہ توپ وتلوار دلوں کو فتح کریں اور کسی آزاد انسان کے قلب وجگر کو اپنے تابع فرماں کر دیں۔ اس کی بنسبت نظریاتی جنگ بہت ہی خطرناک اور المناک ثابت ہوتا ہے، اس کا اگر پوری بیداری، تسلسل کے ساتھ جی بھر کر مقابلہ نہ کیا جائے تو انجام کار مفتوح قوم کے دل بھی فتح ہو جاتے ہیں اور ان کے خیالات ونظریات میں بھی حد درجہ انقلاب آجاتا ہے اور ایک موڑ پر پہنچ جانے کے بعد پھر یہ کرشمہ بھی دیکھنے کو مل جاتا ہے کہ دشمن کو دشمن باور کرانا ہی ان کے لئے مشکل ہو جاتا ہے وہ اس کو دشمن وبدخواہ کی آنکھوں سے نہیں، بلکہ خیر خواہ اور قابل تقلید نمونے کے طور پر دیکھنا شروع کرتے ہیں۔

فکری جنگ کے طرز اور مسلم معاشرے پر اس کے اثرات

دین اسلام کے خلاف جو نظریاتی جنگ شروع ہوئی ہے، وہ مختلف پینترے بدلتی رہی ہے چنانچہ پہلے پہل تو دین اسلام یا اس کے کچھ احکام وتعلیمات پر اعتراضات ہوا کرتے تھے، وہ اعتراض بھی اسی اعتراض ہی کے نام وعنوان سے ہوتے تھے اور اسی شکل

وانداز میں ہوا کرتے تھے، اس کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ مسلمانوں میں رد عمل کے نفسیات آڑے آجاتی تھیں اوراس کی برکت سے ایک طرف عام مسلمانوں کا دین وایمان محفوظ رہ جاتا تھا اور دوسری طرف اہل علم اور زمہ داران امت کے لئے جواب کی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونا بھی کوئی مشکل نہ ہوتا تھا۔ لیکن بعد کے ادوار میں جب سرد جنگ کے محاذ زیادہ کئے گئے توزیادہ چالاکی یہ دیکھنے کو ملی کہ دین اسلام کے حوالہ سے پہلے جو چیزیں اشکال واعتراض کی صورت میں پیش کی جاتی تھیں، وہ اب اس ڈھنگ میں پیش نہیں ہوتی بلکہ پہلے ان کے سانچے میں دین اسلام کو ڈھالا جاتا ہے اور پھر اسی ترمیم شدہ اور مسخ شدہ چیز کو دین اسلام کے نام پر پیش کیا جاتا ہے اور صرف یہی نہیں، بلکہ اس کو دلکش اور جاذبِ نظر عنوانات کے ساتھ اس کی خصوصیات وامتیازات میں جگہ دی جاتی ہے اور دلیل کے انداز میں انہی باتوں کو بنا بنا کر پیش کیا جاتا ہے جو درحقیقت اعتراضات تھے۔

فکری جنگ کے اس پُر فریب انداز سے عوام مسلمانوں کا بھی خوب نقصان ہوا اور اہل علم کے لئے بھی مشکلات کی پٹری سے گزرنا پڑا۔ عوام کا نقصان تو یہ ہوا کہ ان کی خاصی مقدار نے مختلف عناصر کی وجہ سے ان ہی مسخ شدہ چیزوں کو اسلام سمجھنا شروع کیا، اس انوکھے انداز کی وجہ سے انہوں نے ان چیزوں کو دشمن کے ہاتھ کا تیر نہیں سمجھا جو اس سے دور رہنے کا اہتمام کیا جاتا بلکہ اپنا متاعِ عزیز سمجھ کر اس کو دل وجان سے قبول کیا اور ان "نئے تعلیمات" کو ایسے ہی جوش وخروش کے ساتھ قبول کیا جس طرح کوئی مخلص شخص حقیقی دین کو گلے لگاتا ہے۔

اہل علم کے لئے مشکل یہ پیش آئی کہ ہر نئی آواز کو پرکھنا، اس کے درست اور نادرست پہلوؤں کو الگ الگ کرنا اور پھر پوری امت کے قصر ایمان کو اس سے بچائے رکھنا، ان کے لئے بہت مشکل اور صبر آزما کام بن گیا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

فصل دوم:

بے دینی اور دین بے زاری سے معاشرے کو کیا کیا نقصانات کا سامنا کرنا پڑا؟

دین و مذہب ایک ایسی آہنی حائل ہے جس کے ہٹتے یا ختم ہوتے ہی مسائل و مشکلات کی موجیں پورے روانی اور تسلسل کے ساتھ انسانیت کی طرف بڑھنا شروع ہو جاتی ہیں، مصائب کا کوہِ گراں اس کے سر آپڑتا ہے جو اس قدر دراز تر اور قد آور ہوتا ہے جتنی انسان کی نگاہ۔ جو قدم قدم پر انسان کے ساتھ رہتا ہے اور اپنے تئیں اس کو دبائے رکھتا ہے۔ کسی آن وہ سکون کے کمرے میں داخل ہونا بھی چاہے یا فلاح و کامرانی کا چہرہ دکھائی بھی دینے لگے تو فورا مشکلات کی فوجیں سلامی دینے حاضر ہو جاتے ہیں اور اس کی توقعات کو خاکستر بنا کر رکھ دیتے ہیں۔ بے دینی اور دین بے زاری وہ رفیق سفر ہے جو دیکھنے میں بڑا خوبصورت، خوش مزاج اور دل آفرین ظاہر ہوتا ہے لیکن اس کا باطن ظاہر سے سو فیصد مخالف زاویہ پر ہوتا ہے، اپنے اندر سے وہ نہایت بد صورت، بد مزاج اور نفرت و بغض کا استعارہ ہوتا ہے جو اپنے رفیق کو کسی لمحے راہ راست پر چڑھتا یا چلتا دیکھنے کو گوارا نہیں کر سکتا اور ہمیشہ اس کو غلط رخ پر ڈال کر ہی دم لیتا ہے۔

بعید نہیں ہے کہ کوئی دوست اس کو ادیبانہ لفاظی خیال کریں یا مصنوعی انشاء پردازی پر محمول فرمائیں لیکن حقیقت یہی ہے کہ اگر غیر مذہبی زندگی کو جھانک کر دیکھا جائے اور قومی سفر کے مختلف مرحلوں میں اس کو جانچا پرکھا جائے تو اُس کی یہی تصویر ظاہر ہوگی جو اوپر درج کی گئی ہے۔

یادرہے کہ یہاں دنیوی نقصانات کا ذکر ہے، جہاں تک آخرت کا معاملہ ہے جو انسانیت کا اصل ٹھکانہ اور اس سفر زندگی کی اصلی وآخری منزل ہے، وہاں کے متعلق تو کہنا ہی کیا ہے؟ وہاں کی کامیابی وناکامی حقیقی، دائمی اور فیصلہ کن ہے، دین بے زاری اور بے دینی کا اصل عذاب ونتیجہ تو وہی ملے گا۔ اس کی صحیح تصویر پیش کرنے کے لئے درج ذیل دو نصوص کو سامنے رکھنا مفید معلوم ہوتا ہے، چنانچہ قرآن کریم میں ارشاد خداوندی ہے:

﴿وَلَوْ أَنَّ لِلَّذِينَ ظَلَمُوا مَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا وَمِثْلَهُ مَعَهُ لَافْتَدَوْا بِهِ مِنْ سُوءِ الْعَذَابِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَبَدَا لَهُمْ مِنَ اللَّهِ مَا لَمْ يَكُونُوا يَحْتَسِبُونَ﴾[۱]

ترجمہ: "اور اگر ظالموں کے پاس جو کچھ زمین میں ہے سب ہو اور اسی قدر اس کے ساتھ اور بھی ہو تو قیامت کے بڑے عذاب کے معاوضہ میں دے کر چھوٹنا چاہیں گے اور اللہ کی طرف سے انہیں وہ پیش آئے گا کہ جس کا انہیں گمان بھی نہ تھا"۔

یہی بات دوسری جگہ ایک اور اسلوب میں بیان فرمائی گئی ہے:

﴿لِلَّذِينَ اسْتَجَابُوا لِرَبِّهِمُ الْحُسْنَىٰ وَالَّذِينَ لَمْ يَسْتَجِيبُوا لَهُ لَوْ أَنَّ لَهُمْ مَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا وَمِثْلَهُ مَعَهُ لَافْتَدَوْا بِهِ أُولَٰئِكَ لَهُمْ سُوءُ الْحِسَابِ وَمَأْوَاهُمْ جَهَنَّمُ وَبِئْسَ الْمِهَادُ﴾[۲]

---

[۱] الزمر: آیۃ ۴۷.

[۲] الرعد: آیۃ ۱۸.

ترجمہ: "جنھوں نے اپنے رب کا حکم مانا ان کے واسطے بھلائی ہے اور جنھوں نے اس کا حکم نہ مانا اگر ان کے پاس سارا ہو جو کچھ زمین میں ہے اور اس کے ساتھ اتنا ہی اور ہو تو سب جرمانہ میں دینا قبول کریں گے ان لوگوں کے لیے برا حساب ہے اور ان کا ٹھکانا دوزخ ہے اور وہ برا ٹھکانا ہے"۔

اس لئے ان نقصانات کا احاطہ کرنا یہاں مقصود نہیں ہے بلکہ چند نمایاں نقصانات کو اشارات میں ذکر کیا جاتا ہے اور یہاں جن نقصانات کا ذکر کیا جا رہا ہے، ان میں سے اکثر ایسے ہیں جو گنتی میں تو ایک ہی نقصان کے طور پر گنے جاتے ہیں لیکن حقیقت میں اس کی حیثیت ایک جنس کی ہے جس کے تحت مختلف اصناف اور پھر افراد داخل ہوتے ہیں۔ یہاں قدیم فلسفہ کے تین شاخوں کی ترتیب پر ان نقصانات کا ذکر کیا جاتا ہے تاکہ سمجھنا آسان ہو اور بات میں انضباط پیدا ہو۔

تہذیب اخلاق کی حد تک بے دینی کے نقصانات

۱: مذہب سے عاری اور اس سے باغی شخص عموماً اللہ تعالیٰ کی ذات ستودہ صفات اور روزِ آخرت پر یقین وایمان رکھنے کی نعمت سے محروم ہوتا ہے، حالانکہ اسی ایمان کے بہت سے فوائد وبرکات ہیں جن میں سے بڑا فائدہ یہی ہے کہ فرد کی زندگی میں اعتدال وتوازن پیدا ہو جاتا ہے، اس کا کردار وگفتار ایک خاص سانچے میں ڈھلنا شروع ہو جاتا ہے، زمانے کے مشکلات وحوادث اس میں مایوسی کی بیج بونے سے عاجز آجاتے ہیں اور خوشیوں ونعمتوں کی موجیں اس میں کوئی ایسا تلاطم پیدا کرنے سے قاصر رہتی ہیں جس کی وجہ سے وہ اپنے حدود سے نکل کر کسی کے لئے دردِ سر بن سکے۔

۲: انسان جو کچھ کرتا ہے وہ اپنی سوچ و تصور کے تحت کرتا ہے، پہلے کسی بات کا شعور پیدا ہوتا ہے، پھر اس کا قصد وارادہ پیدا ہوتا ہے اور اس کے بعد اس کو کرنے کا مرحلہ آتا ہے، اس لئے انسان کے اچھے یا برے ہونے میں اس کی سوچ کے دائرہ کار کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہے اور اسی سوچ کے دائرے کو دیکھ کر انسان کی حیثیت اور اس کا کردار وگفتار معلوم کیا جاسکتا ہے۔ بے دینی اور دین بے زاری کا بڑا نقصان یہ ہے کہ اس سے انسان کی سوچ کا زاویہ ہی بدل جاتا ہے، اور نقصان کو فائدہ اور فائدے کو نقصان تصور کرجاتا ہے۔

خود غرضی کا آغاز وانجام

آخرت اور وہاں کے جزا و سزا پر یقین رکھنے والا شخص صرف اپنے لئے ہی نہیں سوچتا، بلکہ وہ دیگر انسانوں کے لئے سوچتا رہتا ہے اور جو کچھ اپنے لئے سوچتا ہے تو اس کا محور بھی صرف مادی دنیا اور یہاں کے ساز وسامان نہیں ہوتے بلکہ اپنے لئے سوچنے میں بھی آخرت اور وہاں کی کامیابی وناکامی کا نمایاں حصہ ہوتا ہے۔ اس کے مقابل جو شخص دین بے زار ہوتا ہے اس کی سوچ کا قبلہ وکعبہ ہی دنیا اور مادہ ہوتا ہے، وہ یہیں کا ہو کر رہ جاتا ہے جس کی وجہ سے اس میں مادیت اور دنیویت پیدا ہو جاتی ہے اور یہی سے خود غرضی جنم لینا شروع ہو جاتی ہے۔ خود غرض شخص اپنے ہی مصلحت کے حصول اور اپنے ہی ذات سے مضرت کو دور رکھنے کی کوششوں میں زندگی بسر کرتا ہے، اس کی ساری [illegible] یں اسی کام میں صرف ہوتی ہیں۔ اس خول سے نکلنا اس کے لئے جان دینے کے مترادف ہو جاتا ہے، جس طرح مچھلی پانی سے نکلنے کا تصور نہیں کر سکتی اور اگر جبر وتکلف سے کام لیکر اس کو باہر نکالا بھی جائے تو بھی اس کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ پانی میں واپس غوطہ لگائے اور اپنی

کے لئے وہ تڑپتی رہتی ہے، یہی حال اس انسان کا ہوتا ہے، اس کی سوچ وفکر کی دنیا ایسی ہی محدود ہوتی ہے جیسے کہ کنویں کی مینڈک کا تصور کنویں ہی تک محدود ہوتی ہے۔

اخلاق ومعاشرت میں سینکڑوں مفاسد ایسے ہیں جن کی تعمیر ہی "خود غرضی" کے اینٹ پر ہوتی ہے، اگر کوئی دعویٰ کرے کہ بیشتر معاشرتی مفاسد میں اسی خود غرضی کا کسی نہ کسی حد تک کردار ہے تو شاید کچھ زیادہ مبالغہ آمیز بات نہ ہوگی۔

۳: فرد کو دین بے زاری کی وجہ سے دنیا میں مجموعی طور پر درج ذیل مفاسد کا سامنا کرنا پڑتا ہے:

الف: بامقصد زندگی سے محرومی۔

ب: ہر معاملہ میں خود غرض ہو جانا اور ہر چیز میں اپنے ہی مادی مفاد کا متلاشی رہنا۔

ج: سکونِ قلب کی نعمت اور اطمینان وچین کی لذت سے نا آشنا ہونا۔

د: غیر معمولی اخلاقی بگاڑ کا پیدا ہونا۔

ر: نفسیاتی دباؤ وغیرہ مشکلات کا شکار ہو جانا۔

تدبیر منزل کے میدان میں نقصانات

۱: دین بے زاری کی وجہ سے فرد کی زندگی پر جو کچھ اثرات پڑتے ہیں، ان کا اثر یہاں تدبیر منزل میں بھی محسوس ہوگا، گویا کہ منزل ایک چھوٹے حوض کے مانند ہے جہاں مختلف نالیوں سے پانی آتا ہے، اگر نالی سے گدلا پانی آئے گا تو حوض کا پانی بھی گدلا ہی ہوگا، بلکہ جس طرح مختلف نالیوں میں سے اگر کوئی ایک نالی بھی ایسی ہو جہاں سے گدلا، کھلا کھلا پانی حوض میں آتا ہو تو اس کی وجہ سے پورے حوض کا پانی متاثر ہوگا اور وہ اچھی طرح صاف ستھرا، خوش ذائقہ اور خوش نما پانی نہیں بن سکے گا، یوں ہی اگر معاشرے میں

چند افراد بھی دین بے زار ہوں اور معاشرے میں ان کا کوئی مقام و کردار ہو تو ان چند کی وجہ سے پورے معاشرہ میں تعفن کی لہریں پھیلتی ہیں۔

۲: مذہبی معاشرے میں خاندانی نظام مضبوط تر ہوتا ہے، ہر رشتے کے اپنے اپنے حقوق متعین ہوتے ہیں جن میں کوتاہی کرنا یا غفلت برتنا قابل مؤاخذہ جرم شمار ہوتا ہے اور چونکہ یہ غیر متزلزل یقین بھی ہوتا ہے کہ جو ہستی اس کا مؤاخذہ کرے گی وہ ظاہر و باطن سے یکساں طور پر واقف ہے، سارے حالات کو وہ خود دیکھتا سنتا ہے، اس لئے وہ پورے خلوص اور دل کی گہرائی سے ان حقوق کو بجالانے کی کوشش کرتا رہتا ہے اور اگر کسی کے حق میں کوئی کوتاہی یا حق تلفی بھی ہو جائے تو اس کی تلافی کرنے کو ضروری سمجھتا ہے۔

مذہب بے زار معاشرے ان حقوق سے آزاد بلکہ محروم ہی ہوتے ہیں اور اگر اس حوالہ سے وہ کسی چیز کی پرواہ کرتے ہیں تو صرف مادی منافع یا رسم و قانون ہی ہے لیکن رسم و قانون تو زیادہ سے زیادہ انسان کی جلوت کو کسی حد تک سیدھا رکھ سکتی ہے، اس کی خلوت کو اور جلوت کے بھی تمام تر صورتوں کو خط مستقیم پر لانا اور پھر اسی پر اس کو برقرار رکھنا اس کے دسترس سے باہر اور بہت باہر رہتا ہے، اس لئے مادی منافع کا محرک ہی اس کا اصل باعث بنتا ہے اور اس کا نتیجہ واضح ہے کہ مادی مفادات میں عام طور پر ٹکراؤ کی فضاء بنتی ہے، ضروری نہیں ہے کہ جس چیز میں کسی بھائی کو اپنا کوئی مادی مفاد محسوس ہوتا ہو بہن کو بھی اس میں اپنا مفاد دکھائی دے، اس لئے ایسے موقعوں پر ناہمواریوں کی ہزار صورتیں جنم لینا شروع ہو جاتی ہیں اور گھرانے کے آپس کی زندگی میں بھی خیر خواہی اور ایثار کے جذبات ختم ہونا شروع ہو جاتے ہیں، اس کی جگہ متضاد جذبات پھوٹنا شروع

ہو جاتے ہیں اور چونکہ آپس میں اختلاط بھی ہوتا ہے اس لئے آئے دن مختلف موقعوں پر ان جذبات کی آبیاری ہوتی رہتی ہے۔

۳: جس طرح تہذیب اخلاق میں فرد کی زندگی کا ایک مقصد ہوتا ہے جس کا حاصل کرنا ہی اس کی زندگی کا محور ہوتا ہے اور اس کی ساری محنت اسی مقصد کے ارد گرد گھومتی ہے، مقصد کے حاصل ہو جانے کو کامیابی اور نہ حاصل ہونے کو ناکامی تصور کیا جاتا ہے، یوں ہی منزل کی زندگی بھی بے مقصد نہیں ہے بلکہ اس کے بھی کچھ خاص اہداف ہوتے ہیں اور ان اہداف کو اسی وقت حاصل کیا جاسکتا ہے جبکہ افرادِ منزل کی ترجیحات واہداف میں باہم تزاحم و ٹکراؤ کی فضاء قائم نہ ہو بلکہ ایسے عناصر ہی کو برقرار نہ رکھا جائے جن کی وجہ سے باہم اختلاف اور ٹکراؤ کی صورتِ حال پیدا ہو جائے۔ اور یہ کام صرف مذہب اور عقیدہ آخرت ہی کے ذریعے مکمل ہو سکتا ہے، مادیت اور دنیویت کا خاصہ یہ ہے کہ اس سے آپس میں اختلاف کی کیفیت پیدا ہو جائے کیونکہ انسان صرف اپنی ہی مفاد کا مشتاق ہوتا ہے اور اسی سے اس کو غرض ہوتی ہے، لہٰذا مفادات میں تصادم کے وقت اختلاف کا ہونا ضروری ہے کیونکہ مفادات میں تصادم کوئی اتفاقی امر نہیں ہے جو کبھی پیش نہ آتا ہو بلکہ آئے دن اس سے واسطہ پڑ سکتا ہے۔

سیاست مدینہ کے باب میں دین بے زاری کا خمیازہ

شہر و تمدن اور ملک و سلطنت مختلف افراد اور گھرانوں کے جمع کرنے سے ہی وجود میں آتی ہے، اس لئے جس طرح کے لوگ اور گھرانے ہوں گے، اسی قسم کا شہر و تمدن بنے گا۔ بے دینی اور دین بے زاری کی وجہ سے فرد و منزل میں جو جو خرابیاں در آتی ہیں، شہر و تمدن بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ دین بے زار ریاستوں

میں ایک دوسرے کی جان، مال اور عزت وآبرو پر ظلم وتعدی کی سینکڑوں شکلیں وجود میں آتی رہتی ہیں جن کی وجہ سے ملک کے معاشرتی نظام کو استحکام کی دولت نصیب نہیں ہوتی۔ اگر اپنے مادی مفاد کے حصول کی راہ میں کوئی رسم یا قانون وغیرہ حائل ہو تو اس سے نمٹنے کی بھی نت نئے راستے پیدا کئے جاتے ہیں جس کا ایک بھیانک نتیجہ یہ سامنے آتا ہے کہ جن چیزوں کے سہارے ظلم وتعدی کو روکا جاسکتا تھا، وہی اس ظلم کے پھیلانے بلکہ اس کو مضبوط بنیادیں فراہم کرنے کا ذریعہ بن جاتی ہیں۔

اسلامی ممالک کی صورتِ حال برعکس کیوں؟

بہت سے لوگ ان باتوں کو درست تسلیم نہیں کرتے، ان کا خیال یہ ہے کہ اگر یہ باتیں سچ اور واقع کے مطابق ہیں تو پھر ہونا یہ چاہئے کہ اسلامی ممالک میں ظلم وتعدی کی صورتیں کم ہوں اور ان کی بنسبت دین بے زار ممالک میں اس کا زور زیادہ ہو، لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ صورت حال اس کے برعکس ہے، پھر کیونکر ان فلسفیانہ باتوں کو قبول کیا جائے جن کی کوئی راسخ بنیاد ہی موجود نہ ہو!

اس کا جواب یہ ہے کہ اسلام اور اسلامی ممالک ایک چیز نہیں ہے بلکہ دونوں میں متعدد فروق ہیں اور اس غلط فہمی کا باعث یہی ہے کہ ان دونوں چیزوں کو ایک سمجھ لیا گیا ہے۔ آج کل جس کو اسلامی ملک یا اسلامی ریاست کہا جاتا ہے وہاں عملی طور پر اسلام کی تمام تعلیمات کا نافذ ہونا کوئی ضروری نہیں ہوتا، یہی وجہ ہے کہ اس دھرتی پر پچاس سے زیادہ ممالک ہیں جن کو اسلامی کہا جاتا ہے اور وہ خود بھی اس نام کا بڑے طمطراق کے ساتھ دعویٰ بھی کرتے ہیں لیکن اس کے باوجود دین اسلام اپنے تمام تر ہدایات واحکام کے ساتھ

کہیں بھی جلوہ گر نہیں ہے، کوئی ملک ایسا نہیں ہے جو پورے اسلام کو اپنے ہاں کوئی باعزت وبااختیار مقام دینے پر آمادہ ہو۔

اس لئے یہ سوال بے جا ہے کہ اگر اسلام کے متعلق درج بالا باتیں سچی ہیں تو پھر اسلامی ممالک میں اس کے مطابق نیک اثرات کیوں نہیں محسوس ہوتے؟ وجہ یہ ہے کہ ان ممالک میں کہیں بھی مکمل اسلام نافذ نہیں ہے، ماضی میں تو اس بات کی دسیوں مثالیں ہیں کہ اسلامی نظام جب کامل طریقے سے نافذ ہوتا ہے تو اس کے کتنے دوررس اور خوش کن اثرات تمدن پر پڑتے ہیں اور مستقبل میں بھی اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے امید ہے کہ دنیا اس کا نمونہ دیکھ لے گی اور دیکھتے ہی ان کی آنکھوں کو وہ ٹھنڈک نصیب ہوگی جن سے وہ پہلے سے آشنا نہیں ہوں گے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

باب چہارم:

دین داری اور دین بے زاری کے اسباب اور سدّباب

پچھلے باب میں کسی قدر تفصیل کے ساتھ اس بات کا جائزہ لیا گیا کہ موجودہ دور میں دین داری اور بے دینی کے کیا کیا مظاہر ہیں؟ شریعت کے احکام وہدایات پر عمل کرنے اور اس سے روگردانی اور اعراض کرنے کا تناسب کیا ہے؟ اور اس جائزے کا حاصل یہ تھا کہ بے دینی اور دینی احکام کی بجا آوری میں کوتاہی کے مواقع زیادہ ہیں اور دین داری کی بجائے بے دینی کی شکلوں کی بہتات ہیں۔ اب طبعی طور پر یہ سوال اٹھتا ہے کہ آخر اس بے دینی اور دین بے زاری کے اسباب کیا ہیں؟ امت مسلمہ کیوں اس قدر انحطاط وپستی کے گھڑے میں غرق یاب ہوئی؟ دین وشریعت اور آسمانی ہدایات وتعلیمات پر عمل کرنے کی سعادت سے یہ امتِ مرحومہ محرومیت کی شکار کیوں ہوئی؟ اس کے بنیادی عناصر اور اسباب کیا ہیں؟ اس باب میں اسی سوال کا جواب دینا مقصود ہے۔

لیکن پہلے ہی قدم سے واضح رہے کہ اس سوال کا جواب اور اس سے متعلقہ تفصیلات بذات خود مقصود نہیں ہیں اور ایک مسلمان کے شایانِ شان نہیں ہے کہ وہ ان جیسی موضوعات میں بحث برائے بحث کے طور پر مشغول رہے بلکہ اصل مقصود اس بحث میں داخل ہونے سے یہ ہے کہ مرض کہ تشخیص ہو کر علاج کے راستے پر غور وفکر کیا جائے۔ چنانچہ جس طرح ایک انسان پر تندرستی اور بیماری کے مختلف عوارض پیش آتے رہتے ہیں اور علاج کا طریقہ یہی ہوتا ہے کہ پہلے مرض کی نوعیت اور اسباب معلوم کرلئے جاتے ہیں، اس کے بعد پھر ان اسباب کو ختم کرنے یا اس میں اعتدال پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی

ہے، اس کو علاج کہا جاتا ہے اور اسی سے بیمار شخص روبہ صحت ہو جاتا ہے یوں ہی اقوام وملل کا حال بھی حضرت انسان سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہے، اس پر مختلف حالات آتے رہتے ہیں، عزت وپستی اور عروج وزوال کے مختلف نشیب وفراز سے اس کو گزارا جاتا ہے، اور جب کبھی پستی وزوال کی نذر ہونے لگے تو پھر اس کے علاج کی فکر کرلینا ضروری ہوتا ہے اور علاج کا فطری ومجرب طریقہ یہی ہے کہ پہلے اس کی ذلت وزوال کا سبب دریافت کرلیا جائے اور پھر اس کے مطابق کوئی مناسب ومعقول تدبیر انجام دیا جائے۔

اسی جذبے کے تحت امت میں بے دینی کے اسباب اور وجوہات پر غور کیا جاتا ہے اور اس کے سراغ معلوم کرنے کی کوشش کی جاتی ہے تاکہ اس کے سدباب کے لئے مؤثر ومعقول تدابیر سوچی جائے اور بے دینی کے اس سفر کو روک کر دین داری کی طرف موڑ لیا جائے۔

یہ سوال کچھ نیا نہیں ہے بلکہ امت کے بہی خواہ اور اس کے درد مند وفکر مند قلب وجگر کے حامل شخصیات پہلے بھی اس کو اپنے بحث وتحقیق کا موضوع بنا چکے ہیں اور جب سے امت کی گاڑی کا رخ بے دینی کی طرف ہوا ہے، اس وقت سے لے کر آج تک مختلف زمانوں میں متعدد شخصیات نے اس کے اسباب معلوم کرنے کی بھی کوششیں فرمائی ہیں اور اس کے روک تھام کی بھی کسی نہ کسی درجہ میں محنتیں فرمائی ہیں۔ اس لئے یہاں پہلے چند نمایاں مفکرین حضرات کی آراء ذکر کئے جائیں گے اور چونکہ یہی چیز ایک عرصہ سے اس سیاہ کار کی بحث وفکر کا محور رہی ہے اس لئے آخر میں اس کا خیال بھی ذکر کردیا جائے گا ان شاء اللہ۔

پہلی وجہ: سائنس اور اسلام کا تصادم

جو لوگ ان موضوعات پر گفتگو کرتے ہیں، ان میں سے اکثریت تو نہیں، البتہ ایک کثیر تعداد ان حضرات کی ہے جن کی رائے میں موجودہ بے دینی کی اصل جڑ سائنس اور اسلام یا کسی بھی دین و مذہب کا تصادم ہے۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ گزشتہ چند صدیوں سے سائنس مسلسل ترقی کی راہ پر گامزن ہے جو مختلف میدانوں میں تبدیلیوں پر تبدیلیاں لا رہا ہے، آسمان و زمین اور ان کے درمیان موجودہ خلاء و فضاء میں موجود بہت سی چیزوں کی حقیقت سے پردہ ہٹایا اور بہت سی چیزیں ایسی ہیں جن کا مشاہدہ کیا گیا، ایجادات و مصنوعات کی ندیاں بہہ پڑی جن کی وجہ سے ہر شعبہ زندگی میں غیر معمولی جدت و ترقی ہوئی، یہی سائنس ہی ہے جس کی بدولت قوانین فطرت تک انسانیت کی رہنمائی ہوئی اور اس کی وجہ سے بہت سے مذہبی مسائل و تعلیمات کی بنیاد متزلزل ہو گئی، لہٰذا اس کے نتیجے میں مذہب پر سے اعتماد اٹھتا چلا گیا اور یوں بے دینی کے بند وا، اس سیل رواں بن کر انسانیت کو اپنے بہاؤ میں لیتی چلی گئیں جس کا سلسلہ ہنوز جاری ہے۔

ڈاکٹر جان ولیم ڈریپر وغیرہ کا دعویٰ

ایک انگریزی مصنف ڈاکٹر جان ولیم ڈریپر نے اپنی مشہور کتاب "A history of the conflict between religion and science" میں اس نقطہ نظر کو بڑے بسط و تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے اور اس میں سائنس اور مذہب کو آپس میں دو متقابل و متصادم اشیاء کے طور پر پیش کر کے مختلف مسائل میں ان دونوں کی باہمی لڑائی دکھائی، مثال کے طور پر مسئلہ توحید، ماہیت روح، ماہیت عالم، زمین کی عمر، معیارِ حق وغیرہ مسائل کو عناوین بنا کر اس میں سائنس اور مذہب کا باہمی نزاع دکھایا ہے۔ اردو

میں اس کا ترجمہ مولانا ظفر علی خان صاحب مرحوم نے "معرکہ مذہب وسائنس" کے نام سے کیا تھا، جس میں آپ نے جگہ جگہ تنقیدی حاشیے بھی لکھے ہے جو کافی مفید ہیں۔ اس وقت یہی ترجمہ پیش نظر ہے۔[1]

جولین ہکسلے کا کہنا ہے کہ:

"جس طرح ایٹم کے ٹوٹنے سے مادہ کے بارے میں انسان کے پچھلے تمام تصورات ختم ہوگئے اسی طرح پچھلی صدی میں علم کی جو ترقی ہوئی ہے وہ بھی ایک (Knowledge Explosion) علمی دھماکہ ہے، جس کے بعد خدا اور مذہب کے متعلق پرانے خیالات بھک سے اڑ گئے ہیں۔"[2]

چند بنیادی ضروری باتیں

اس بات کا تو انکار نہیں ہے کہ بہت سے لوگوں نے اپنے بے دینی کو جواز فراہم کرنے کے لئے اسی سائنس کو ڈھال بنا رکھا ہے لیکن در حقیقت یہ بے دینی کا سبب ہے اور نہ ہی دین بے زاری کا کوئی باعث ہے، اس کے متعلق چند بنیادی باتیں یہ ہیں:

الف: سائنس کی ہم جو بھی تشریح کریں لیکن بہر حال یہ انسانی ادراک ودریافت ہی سے عبارت ہے اور انسان جب کوئی چیز دریافت کرتا ہے تو ظاہری طور پر اس کے دو ہی بنیادی ذرائع ہیں: ایک حواس خمسہ اور دوسرا عقل۔ اب سائنس کا تو یہی دائرہ کار ہے اور

---

[1] اس مترجم کتاب میں ایک فائدے کی بات یہ ہے کہ مولوی عبد الحق، جو بابائے اردو کے نام سے مشہور ہے، نے اس کا بڑا ضخیم اور جاندار مقدمہ لکھا ہے جس میں آپ نے مذہب کی اہمیت اور اس کے متعلق اٹھائے جانے والے شبہات کا تفصیلی جائزہ لیا ہے۔ اگر کوئی باذوق وخوش نصیب اس مقدمہ کی خدمت کرکے الگ کتابی صورت میں شائع کرے تو امید ہے کہ بڑا مفید ثابت ہوگا، ان شاء اللہ۔

[2] ہندوستان ٹائمز، سنڈے میگزین، ۲۳ ستمبر ۶۱۔

یہی اس کی بنیادیں ہیں جبکہ مذہب کی بنیاد ان دونوں سے الگ اور بالکل الگ ہے، دین ومذہب کا مصدر وحی ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے آتی ہے اور یہی اس کا دائرہ کار ہے۔ لہذا جب ان دونوں چیزوں کا میدان اور دائرہ کار ہی جدا جدا ہے تو دونوں کے درمیان باہمی تصادم کا سوال ہی پیدا نہیں ہے جس کے نتیجے میں ایک کو بلا وجہ پچھاڑنے اور مغلوب دکھانے کی کوشش کی جائے۔ کیونکہ یہ مسلم ضابطہ ہے کہ تصادم وٹکراؤ تب پیدا ہو جاتا ہے جب دو چیزیں برابر ایک جگہ پر ہوں، چنانچہ اگر دو گاڑیاں الگ الگ سڑک پر گزر رہی ہے تو ان کا آپس میں ٹکرانا کیونکر متصور ہو سکتا ہے!

مثال کے طور پر انسان چاند پر پہنچ سکتا ہے یا نہیں؟ زمین کی شکل وہیئت کیسی ہے؟ گول ہے یا کچھ اور؟ آسمان کا رنگ وروغن کیسا ہے؟ اور اس کے جسم کی اجزائے ترکیبی کیا ہیں؟ کن کن چیزوں سے آسمان بنا ہے؟ وغیرہ۔ یہ ایسی باتیں ہیں جن سے قرآن وحدیث نے کوئی تعرض نہیں فرمایا کیونکہ یہ مذہب کے موضوع اور اس کے دائرہ کار ہی سے باہر ہے، اسی طرح یہ چیزیں تو عقل وتجربہ سے معلوم ہو سکتی ہیں چنانچہ اب یہی دعویٰ کیا جارہا ہے جبکہ مذہب کی بنیاد تو وحی پر ہے اور وحی کی ضرورت وہاں پڑتی ہے جہاں انسانی حواس اور عقل جواب دے جاتے ہیں۔

حضرت مولانا محمد اسماعیل دہلوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"مذہب نے جس چیز کا انکار کیا ہے، اور دعوی کیا ہے کہ وہ موجود نہیں تو یقین کرنا چاہیے کہ واقع میں بھی وہ (دعویٰ) ثابت ہے[1]"، البتہ جن امور کی نفی واثبات کے متعلق مذہب نے خاموشی

---

[1] اور آج تک کوئی یہ ثابت نہیں کر سکا کہ مذہب نے کسی چیز کے وجود کے متعلق یا عدم وجود کے متعلق خبر دی اور سائنس نے اس کے خلاف ثابت کیا ہو۔

اختیار کی ان کے متعلق ہونے نہ ہونے دونوں باتوں کا احتمال ہے پس غیر مذہبی ذرائع سے کوئی ایسی چیز ثابت ہو یا کسی ایسی چیز کی نفی ثابت ہو جس سے مذہب خاموش ہے تو اس کو مذہب کی مخالفت سے کوئی تعلق نہ ہوگا چاہیے کہ خوب چوکنے ہو ان باتوں کو ذہن نشین کرو، اور غفلت سے جو کام لیتے ہیں ان لوگوں سے نہ بنو۔"[1]

مولانا عبد الباری ندوی فرماتے ہیں:

"ریل کی دو گاڑیاں ٹکرا سکتی ہیں اور ٹکراتی ہیں لیکن ریل گاڑی اور بحری جہاز میں تصادم نہیں ہو سکتا، اس لئے کہ ریل سمندر میں چل نہیں سکتی ہے اور نہ جہاز خشکی پر، بعینہ یہی حال سائنس اور مذہب کا ہے، سائنس کا مذہب کی حد میں داخل ہونا اس سے زیادہ محال ہے جتنا ریل کا پانی میں یا جہاز کا خشکی پر چلنا محال ہے۔ مذہب جہاں سے شروع ہوتا ہے، سائنس کی رسائی وہاں ختم ہو جاتی ہے، سائنس کا جو منتہائے پرواز ہے، مذہب کا وہ نقطہ آغاز ہے۔ سائنس کی بحث و تحقیق کا تعلق تمام تر فطرۃ (نیچر) کے واقعات اور مشاہدات اور تجربات سے ہے، مذہب کی بنا یکسر فوق الفطرت اور تجربہ ومشاہدہ کی دسترس سے ماورا چیزوں پر ہے، مثلاً خدا، روح، حشر و نشر وغیرہ۔"[2]

مولوی عبد الحق صاحب اپنے مخصوص فلسفیانہ طرز میں لکھتے ہیں:

"جہاں سائنس کے پر جلتے ہیں، مذہب نہ صرف ان فرائض کو ادا کرتا ہے جو متعلق انسان کے نفس سے ہیں یا جو دوسروں سے متعلق ہیں۔ بلکہ وہ ان فرائض کا بھی خیال رکھتا ہے جو ان لوگوں کے متعلق ہیں جہاں ہمیں اس دنیا سے کوچ کرنے کے بعد جانا ہے سائنس انسان کی روح اور

---

[1] تحقیقات، ص ۱۹۔

[2] مذہب و عقلیات، در ضمن کتاب "حکمت ایمانیان"، ص ۱۷۔ آپ نے اس موضوع پر اس مقالہ میں تفصیل سے گفتگو فرمائی ہے اور "مذہب اور سائنس" کے نام سے ایک کتاب بھی ہے، ان دونوں تحریرات میں آپ نے بڑے تفصیل و تحقیق کے ساتھ سائنس اور مذہب کے تصادم پر اپنے زریں خیالات کا اظہار فرمایا ہے، موضوع سے مناسبت رکھنے والے حضرات اس کی طرف مراجعت فرمائیں۔

روحانی عالم اور عقبے کا انکار کیا کرے، کیونکہ وہ کوتاہ نظر ہے۔ لیکن اس کے انکار سے کسی شے کی ہستی زائل نہیں ہو سکتی اہل سائنس اپنے بھورے برابر علم پر اس قدر نازاں اور مغرور ہیں کہ جو بات ان کے علم میں نہیں اس سے وہ جھٹ انکار کر بیٹھے ہیں اور چند قانون قدرت جو انہیں معلوم ہوئے ہیں ان پر اس قدر بھروسہ ہے کہ جو بات ذرا ان کے خلاف نظر آئے فوراً کہہ بیٹھے ہیں کہ یہ ناممکن ہیں یہ خلاف قانون قدرت ہے، گویا کائنات کے تمام قوانین اس کے دیکھے بھالے ہیں اور وہ ان سب پر حاوی ہو چکا ہے!۔

لیکن وہ یہ بھول جاتا ہے کہ صرف عقل ہی ایک خصوصیت انسان کی نہیں بلکہ اس میں دوسری قوتیں بھی ہیں، اور احقاق میں صرف عقل ہی پر دارومدار نہیں ہوتا بلکہ اور قوتیں بھی کام میں آتی ہیں انسان کی اخلاق اور روحانی قوتیں کچھ کم اہم نہیں ہیں۔ مثلاً حسن کی دریافت کے لئے ذوق ایسا ہی ضروری ہے جیسی عقل احقاق حق میں، چونکہ مذہب کی بنیاد مافوق العادۃ پر ہے جو عقل سے بالا ہے۔ اس لئے سائنس وہاں نہیں پہنچ سکتا اور اپنی نادانی اور نافہمی سے اس پر حملے کرتا اور اس کے ماننے سے انکار کرتا ہے ایک بات ایسے اور ہاتھ لگ گئی جب اس کی سمجھ میں یہ باتیں نہیں آتی تو وہ صاف کہہ اٹھتا ہے کہ یہ خلافِ قانونِ فطرت ہیں، گویا تمام قوانین فطرت اس کے دیکھے بھالے ہیں اور وہ ان سب پر حاوی ہو چکا ہے۔ اول تو اس کرہ کی جس پر ہم آباد ہیں بساط ہی کیا ہے؟ ایسی صورت میں سائنس کا مذہب کا منکر یا مخالف ہونا سراسر نادانی و نافہمی ہے۔[1]

سائنس اور مذہب کے تصادم کی اصل اساس

ب: مذہب اور سائنس کے تصادم کی جتنی مثالیں پیش کی جاتی ہیں، ان پر انصاف اور گہرائی کے ساتھ غور کرنے سے واضح ہوتا ہے کہ یہ تصادم در اصل مذہب اور اس سائنس کا نہیں ہے جو حواس خمسہ، مشاہدہ یا عقل سلیم پر مبنی ہوتا ہے بلکہ در حقیقت یہ تصادم اہل

---

[1] معرکہ سائنس و مذہب، ص ۵۴ تا ۶۴۔

مذہب اور اہل سائنس کے درمیان واقع ہوا ہے کہ یا تو اہل مذہب نے غلط فہمی سے کسی ایسی چیز کو مذہب کا حصہ سمجھا جو واقعۃً مذہب کا حصہ نہیں ہے اور یا اہل سائنس نے اپنے حدود سے تجاوز کر کے اپنے بہت سے خیالات، تخمینوں اور مفروضات پر بھی سائنسی تحقیق کا لیبل لگایا اور ساتھ یہ تاثر بھی پھیلایا کہ سائنس کی بنیاد مشاہدہ پر ہے۔ اب اس کا نتیجہ یہی ہونا چاہئے کہ جب سائنس کی بنیاد مشاہدہ پر ہے اور مذہب کی فلاں فلاں باتیں اس سائنسی تحقیق سے متضاد ہیں تو یہ باتیں ہی غلط اور خلاف واقع ہیں اور مذہب نے اس کی غلط خبر دی ہے، لہٰذا مذہب پر اعتماد نہیں ہو سکتا۔

کچھ تطبیقی مثالیں

مثال کے طور پر قرآن کریم نے یہ صراحت فرمائی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے زمین کو پھیلایا ہے، اس سے بعض مخلص مسلمانوں نے اپنے تصور کے مطابق یہ اخذ کیا کہ زمین گول نہیں ہے بلکہ وہ چٹائی کی طرح بچھی ہوئی ہے اور گو مربع یا مسدس شکل میں ہے، اب سائنس نے اس کے خلاف مشاہدے کرنے کا دعویٰ کیا، اگر ہم اس دعویٰ کو بالکل درست تسلیم کر لیں اور واقعۃً مان لیں کہ مشاہدہ کے مطابق زمین گول ہی ہے، تو اس سے قرآن کریم کی تردید نہیں ہو سکتی ہے اور نہ ہی اس کے خلاف کوئی سوالیہ نشان پیدا ہو سکتا ہے کیونکہ گول نہ ہونے کی بات قرآن کریم میں نہیں تھی اور قرآن کریم کے اندر جتنی بات مذکور ہے اس سے گول نہ ہونے کی بات لازم نہیں آتی، یہ تو تشریح کرنے والے کا ذاتی خیال تھا، اس خیال کا اگر سائنس کے ساتھ تصادم پیدا ہو جاتا ہے یا یہ تصور خلاف واقعہ ثابت ہوتا ہے تو اس سے اسلام پر کیا حرف آسکتا ہے؟

اسی طرح قرآن وحدیث کا ایک وسیع ذخیرہ اپنا ہے جس میں اللہ تعالیٰ کے وجود اوراس کی وحدانیت اور تدبیر عالم وغیرہ عظمت کی صفات کا درس دیا گیا ہے اور یہ صرف دین اسلام ہی نہیں بلکہ کسی بھی آسمانی دین ومذہب کا بنیادی پتھر ہے جس پر پورے مذہب کی عمارت استوار ہوتی ہے۔ اسی طرح نصوص میں یہ تعلیم بھی دی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی اس پورے کائنات کا خالق ہے، اسی کی ذات ستودہ صفات قدیم ہے اور بس۔

اب بعض سائنسدانوں نے یہ دعویٰ شروع کیا کہ ہم نے اس کائنات کی بہت سی چیزوں کی حقیقتوں اوراس کی خاصیات دریافت کیں ہیں، زمین اور دیگر سیاروں وستاروں کی حرکات وحالات قلمبند کر لئے ہیں اور ہم اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ یہ نظام خود بخود چلتا ہے اوراس کے لئے کسی چلانے والے ہستی کی ضرورت نہیں ہے اور یہ خود سے ہے، اس کے لئے کسی بنانے والے کی ضرورت نہیں ہے۔ تو اب اس دعویٰ کو بھی "سائنس کی تحقیق" کی منقش چادر چڑھائی جاتی ہے اوراس کی بنیاد پر مذہب کے خلاف محاذ کھولا جاتا ہے، لیکن سوال یہ ہوتا ہے کہ یہ کہاں کا مشاہدہ اور کیسا تجربہ ہے؟ کسی چیز کے نہ ہونے کا بھی مشاہدہ وتجربہ ہو سکتا ہے؟ خاص کر ایسی چیز جس کا وجود ایک جگہ ہو اور اس کو تلاش دوسری جگہ کیا جائے تو اس تلاش کا نقد نتیجہ ناکامی ہی ہے۔ گھر کے حدود میں گمشدہ انگوٹھی کو گلی کوچے میں ڈھونڈتے رہنا حماقت نہیں تو اور کیا ہے!

اب عام تاثر تو یہ دیا جاتا ہے کہ اس مسئلہ میں مذہب اور سائنس کا تصادم ہے لیکن حقیقت میں اگر سائنس واقعۃً مشاہدہ اور تجربہ کا نام ہے تو یہ تصادم سائنس کا نہیں ہے بلکہ اس فن سے وابستہ کچھ لوگوں کے ذاتی خیالات مذہب سے متصادم ہو جاتے ہیں اور اس کو یہی تعبیر دینا قرین انصاف ہے۔

دوسری وجہ: دین کے تقاضوں پر نہ چلنا

بعض لوگ مسلمانوں کی کوتاہیوں اور غفلتوں کو اس کا سبب قرار دیتے ہیں، ان کا خیال یہ ہے کہ چونکہ مسلمان دینی احکام وعبادات کے بجالانے میں حد درجہ غفلت اور کوتاہی برتتے ہیں، چنانچہ تیسرے باب میں اس کا کچھ اجمالی جائزہ لیا گیا ہے، اس لئے معاشرے میں بے دینی اور دین بے زاری کی فضاء عام ہوتی چلی جارہی ہے۔

یہ اعمالِ بد کی ہے پاداش ورنہ کہیں شیر بھی جوتے جاتے ہیں ہل میں

یہ بات اگرچہ درست ہے لیکن سوال کا جواب نہیں ہے۔ یہ بے دینی کی توجیہ وتعلیل نہیں ہے بلکہ اس کی تشریح وتفصیل ہے، یعنی دنیا میں بے دینی اس لئے نہیں ہے کہ مسلمان دین کے احکام وتعلیمات پر عمل نہیں کرتے بلکہ یہی تو بے دینی کی تفسیر ہے کہ انسانیت دین کے احکام وتقاضوں پر عمل نہیں کررہی۔ البتہ مسلمانوں کی بے دینی اور اسلامی احکام سے لاپرواہی پر جو اثرات مرتب ہوتے ہیں، مثال کے طور پر ان کا ذلیل ورسوا ہونا، مغلوب ومقہور ہونا، اندرونی اختلافات وجھگڑوں کا شکار ہو جانا، وغیرہ۔ تو اس کی یہ توجیہ بالکل درست ہے کہ چونکہ امت مسلمہ اپنے دین ومذہب کے احکام وتعلیمات پر عمل نہیں کررہی، اس لئے ان نتائج کی شکار ہوگئی۔

تیسری وجہ: اسلامی حکومت کا نہ ہونا

بہت سے لوگوں کے نزدیک حالیہ بے دینی اور دین بے زاری کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ مسلمانوں کے پاس حکومت وخلافت کی باگ ڈور باقی نہ رہی۔ حکومت وسیادت سے

محرومی کی وجہ سے ان کے درمیان بے دینی پھیل رہی ہے اور دین بے زاری کی نت نئے شاخیں ان کے اندر انہی لئے پھل پوٹ رہی ہیں کہ وہ حاکم کی حیثیت سے محروم ہو چکے ہیں۔

حضرت مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی صاحب مرحوم نے اپنی متعدد کتابوں اور خطبات میں اسی بات پر زیادہ زور صرف فرمایا ہے اور دیگر بہت سے مفکرین حضرات کے ہاں بھی یہی تاثر ملتا ہے۔

حضرت مولانا ابو الحسن علی ندوی صاحب رحمہ اللہ نے متعدد جگہ اس کا ذکر کیا ہے۔ آپ نے اپنی مشہور و مفید کتاب "انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر" کے باب چہارم میں "مسلمانوں کے تنزل کا آغاز اور اس کے اسباب" پر تفصیل سے گفتگو فرمائی ہے جس کا حاصل یہ معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان کی امامت وسیادت کا سہرا جب تک ایسے افراد کے ہاتھوں میں تھا جو عدل و تقویٰ اور جہاد واجتہاد وغیرہ ضروری صفات سے آراستہ پیراستہ تھے تب تک ان کا معاملہ عروج وترقی کے مدارج طے کرتا رہا اور جب زمام اقتدار ایسے ہاتھوں میں جا پہنچی جو ان صفات سے عاری تھے تو وہی سے مسلمانوں کا تنزل شروع ہوا۔[1]

چوتھی وجہ: اسلام مخالف جدید نظریات کا میدان میں آنا

عصر حاضر کے فتنوں میں سے ایک بڑا اور بہت بڑا فتنہ موجودہ مغربی اصطلاحات ہے، انسانی زندگی کے ہر اہم شعبے سے متعلق ایک نیا نظریہ اور نئی اصطلاح متعین ہے۔

---

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمائیں: درج بالا کتاب کا باب چہارم، ص ۸۔۱۔

الفاظ کی حد تک تو یہ اصطلاحات بڑی معصوم اور مبنی بر حق محسوس ہوتی ہیں جن سے انکار و مخالفت تو در کنار، شک و تردد کرنا بھی دشوار معلوم ہوتا ہے لیکن حقیقی مفہوم اور اندرونی مضمرات کو ٹٹولا جائے اور دین و عقل کی کسوٹی سے اس کو پرکھ کر دیکھا جائے، تو واضح ہوتا ہے کہ یہ مذہب دشمنی اور دین بے زاری کی تحریک کا مقدمہ یا اس کا تتمہ ہے۔ اس لئے یہ کہنا خلافِ حقیقت یا مبالغہ نہیں ہے کہ یہ اصطلاحات مکروفریب اور دھوکہ نہیں بلکہ دجالیت پر مبنی ہیں۔

بعض مفکرین کی تحقیق یہ ہے کہ موجودہ بے دینی اور دین بے زاری کا اصل عنصر یہی مغربی اصطلاحات ہیں کیونکہ بظاہر ان اصطلاحات میں کوئی اسلام مخالف نظریہ معلوم نہیں ہوتا بلکہ عین اسلام اور اسی کی تعلیم و صدا معلوم ہوتی ہے اور چونکہ اس کا اشتہار بھی بہت ہے چنانچہ بہت سی جگہ بزور بازو اس کو منوایا جارہا ہے، اسی بنیاد پر لوگ اس کو اپنا لیتے ہیں اور پھر وہ غیر شعوری طور پر دھیرے دھیرے دین و مذہب سے نکل جاتے ہیں جس کا آخری سرا دین بےزاری بلکہ دین دشمنی ہے۔ اقوام متحدہ کے حقوق انسانی، انصاف، مساوات، حریت وغیرہ، فرائڈ کا نظریہ جنسیت، مکیاولی کا نظریہ وطنیت، ڈارون کا نظریہ ارتقاء، میکڈوگل کا نظریہ فطرت، ان اصطلاحات میں سر فہرست ہیں۔ ڈاکٹر محمد رفیع الدین صاحب مرحوم نے اپنی کتاب "قرآن اور علم جدید" میں اس پر تفصیلی بحث فرمائی

ہے، ان نظریات کی اجمالی تاریخ اور دین اسلام سے ان کا تصادم اور پھر اس حوالہ سے دین اسلام کا موقف تفصیل سے ذکر فرمایا ہے[1]۔

پانچویں وجہ: قرآن وسنت کو پس پشت ڈالنا

جن شخصیات نے زیر بحث سوال کے جواب دینے کی کوشش فرمائی ہے، ان میں سے بہت سے حضرات کا موقف یہ ہے کہ مسلمانوں کے موجودہ دینی زوال اور دین بے زاری کی بڑی وجہ قرآن وسنت کی تعلیمات پر عمل نہ کرنا اوران کو پس پشت ڈالنا ہے۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ چونکہ مسلمانوں نے قرآن وسنت سے لگاؤ رکھنا چھوڑ دیا اور عملی زندگی میں ان دونوں سرچشموں سے استفادہ کرنے کی روش بھلا بیٹھے، اس لئے اسی سے یہ ساری خرابی پیدا ہوئی۔ اس فکر کے حامل حضرات بعض اوقات فقہی تقلید کو بھی ایک بنیادی سبب کے طور پر گردانتے ہیں بلکہ کئی حضرات کی تحریرات سے تو یہاں تک مترشح ہوتا ہے کہ قرآن وسنت کا چھوڑنا اور فقہی تقلید، گویا دو مترادف الفاظ ہیں۔ خیر، یہ ایک تو مبالغہ ہے جو خواہ کسی بھی جذبے سے ہو، لیکن ہے غلط اور خلاف حقیقت۔ کیونکہ تقلید قرآن وسنت سے اعراض کا نام نہیں ہے بلکہ اسی پر عمل کرنے کی ایک شکل ہے۔ حضرت مولانا اکبر شاہ خان نجیب آبادی صاحب مرحوم نے اس حوالہ سے ایک کتاب لکھی تھی جو لاہور کے نشریاتی

---

[1] سندھ کے مشہور بزرگ، فکر و تصوف پر بیسیوں کتابوں کے مؤلف مکرم جناب محمد موسیٰ بھٹو صاحب زید مجدہم نے اس کتاب کی تلخیص بھی فرمائی ہے جو ڈاکٹر غلام مصطفی صاحب رحمہ اللہ کی تقدیم و تعارف کے ساتھ طبع ہوا ہے۔

ادارہ "دار الابلاغ" سے "امت محمدیہ زوال پذیر کیوں؟" کے نام سے شائع ہوئی ہے۔اس میں یہی فکر دکھائی دیتی ہے۔

چھٹی وجہ: اسلاف کی میراث کا کھونا

بہت سے اہل فکر و نظر حضرات کے نزدیک اس سوال کا صحیح اور درست جواب یہ ہے کہ ہمارے اطوار واحوال چونکہ اسلاف کے احوال سے یکسر مختلف ہو چکے ہیں اور ان کی چھوڑی ہوئی میراث کو ہم کھو چکے ہیں، اس لئے دینی فضاء مکدر ہوئی۔

علامہ اقبال مرحوم ہمارے ان عالی ہمت شاعروں میں سے ہے جن کے سینے میں سوز دروں اور دل میں دینی حمیت کا دریا موجزن تھا، انہوں نے اپنی شاعری میں جس موضوع کے ساتھ کثرت سے تعرض فرمایا ہے، ان موضوعات میں "امت کے احوال اور اس کے نشیب و فراز" کو اختصاصی مقام حاصل ہے، اور یوں تو انہوں نے اس حوالہ سے مختلف افکار پیش کئے ہیں اور متعدد عناصر کی نشاندہی فرمائی ہے لیکن متعدد جگہوں پر مختلف طریقوں سے وہ ان زوال پذیر احوال کی ایک بنیادی وجہ یہ بھی بیان فرمائی ہے کہ امت اپنے اسلاف کی میراث کھو بیٹھی ہے اور اس لئے وہ انحطاط و زوال کی طرف روبہ سفر ہے۔

وہ ایک جگہ فرماتے ہیں:

گنوا دی ہم نے اسلاف سے جو میراث پائی تھی
ثریا سے زمین پر آسمان نے ہم کو دے مارا

اپنے مشہور و مفید قصیدے "شکوہ اور جواب شکوہ" میں تو بار بار مختلف انداز سے اسی بات کی نشاندہی فرمائی، چنانچہ جواب شکوہ میں ایک جگہ کہتے ہیں:

صفحہ دہر سے باطل کو مٹایا کس نے؟

نوعِ انسان کو غلامی سے چھڑایا کس نے؟
میرے کعبے کو جبینوں سے بسایا کس نے؟
میرے قرآن کو سینوں سے لگایا کس نے؟
تھے تو آباء وہ تمہارے ہی، مگر تم کیا ہو؟
ہاتھ پر ہاتھ دھرے منتظرِ فردا ہو!

ایک جگہ لکھتے ہیں:

کس کی آنکھوں میں سمایا ہے شعارِ اغیار؟
ہو گئی کس کی نگہ طرزِ سلف سے بے زار؟

آگے کہتے ہیں:

باپ کا علم نہ بیٹے کو اگر از بر ہو
پھر پسر قابلِ میراثِ پدر کیونکر ہو!
ہر کوئی مستِ مئے ذوقِ تن آسانی ہے
تم مسلمان ہو! یہ اندازِ مسلمانی ہے؟
حیدری فقر ہے نہ دولتِ عثمانی ہے
تم کو اسلاف سے کیا نسبتِ روحانی ہے؟
وہ زمانے میں معزز تھے مسلماں ہو کر
اور تم خوار ہوئے تارکِ قرآں ہو کر

ساتویں وجہ: تکوینی تقاضا

بعض لوگ اس سوال کا جواب دیتے ہیں کہ یہ سب کچھ تکوینی امور ہیں جن میں زیادہ دخل اندازی کی ضرورت نہیں ہے اور چونکہ قیامت قریب ہے اور اس کے علامات ونشانات سامنے آچکے ہیں، اس لئے قیامت سے پہلے امت کا ایسے حالات سے گزرنا کوئی بعید نہیں ہے بلکہ خود نصوص میں اس کی پیش گوئی فرمائی گئی ہے۔

تجزیہ: اگر تکوینی ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے قصد وارادے اور اس کی قدرت وحکم سے یہ سارے حالات پیدا ہوئے ہیں تو اس کے ماننے میں ایک مسلمان کو کوئی تامل نہیں ہو سکتا اور بلاشبہ کائنات میں جو کچھ ہوا ہے یا ہو گا، وہ اللہ تعالیٰ کی مشیت کے مطابق ہی ہوا ہے اور اسی کے تحت سارا کچھ ہوتا رہے گا، لیکن اگر تکوینی کا مطلب یہ ہے کہ یہ سب کچھ حالات بلا سبب بنے ہیں یا ان پر سوچنے اور مقابلہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے تو یہ دونوں باتیں قابل اشکال ہیں، خاص کر آخری بات تو سخت اشکال وانکار کا موجب ہے، یہ تصور دعوت دین کی راہ میں بڑی رکاوٹ ہے۔ اشکال کی وجہ یہ ہے کہ دنیا کا یہ نظام اسباب کے ساتھ بندھا ہوا ہے اور حقیقت میں اگرچہ سب چیزوں کا خالق، مالک اور مدبر اللہ تعالیٰ ہی ہے لیکن ظاہری طور پر سب چیزیں اسباب کے ساتھ لگی بندھی معلوم ہوتی ہے کہ اگر اسباب کو عمل میں لایا جائے گا تو نتیجہ حاصل ہو گا ورنہ نہیں۔ ٹھیک اسی طرح اقوام وملل کا عروج وزوال بھی بغیر سبب نہیں ہوتی بلکہ اس کے بھی مختلف اسباب ہوتے ہیں، جن کی وجہ سے کسی قوم کو عروج وترقی کے منازل یا زوال وانحطاط کی گھاٹیوں پر سے گزرنا پڑتا ہے، علامات قیامت کے متعلق جو نصوص وارد ہوئے ہیں، ان میں بھی متعدد

اسباب کی طرف اشارہ فرمایا گیا ہے کہ امت جب فلاں فلاں کام کرے گی تو ان پر فلاں فلاں حالات طاری ہوں گے۔

12 اسی طرح یہ جو دوسری بات ہے کہ ان غیر دینی فضاء کے مقابلہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے، اس کا غلط، مذموم اور خلاف شریعت ہونا تو اتنا واضح ہے جس کی تفصیل میں جانے کی ضرورت ہی نہیں ہے، جب تک اجتماعی یا انفرادی طور پر دین بے زاری کے اسباب کا مقابلہ ممکن رہے اور اس میں کسی حد تک کامیابی کی بھی توقع رہے، اس وقت تک اپنی استطاعت کے مطابق کام کرنا اور کرتے رہنا ضروری ہے اور ہاتھ پے ہاتھ دھرے بیٹھنا اور فرداں کے انتظار میں رہنا شرعی اور عقلی ہر لحاظ سے مذموم و مکروہ ہے، تاہم یہ بات اپنی جگہ درست ہے کہ جب حالات اس قدر سنگین ہو جائے جہاں دینی بات کرنے کا کوئی فائدہ متوقع نہ رہے، وہاں مسلمان کے سر سے یہ ذمہ داری بھی اتر جاتی ہے۔

آٹھویں وجہ: اسلام دشمن طاقتوں کا یلغار

بہت سے لوگ مغربی یلغار کو اس کا ذمہ دار ٹھہراتے ہیں اور کہتے ہیں کہ چونکہ دور حاضر میں پورا عالم اسلام مغرب کے دباؤ کی ضد میں ہے اور جہاں بھی احیاءِ اسلام کی کوئی خاطر خواہ محنت سر اٹھاتی ہے تو مغربی یورش کا رخ اس کی طرف مڑ جاتا ہے اور مختلف ذرائع سے اس کو کچل کر زمین بوس کرنے کی سر توڑ کوششیں کی جاتی ہیں، اگر اس سے کام نہ چلے تو مغرب اپنے پورے لاؤ لشکر سمیت اس کی طرف پیش قدمی کرتا ہے اور بالآخر دین حق کے لئے کی جانے والی کوششوں کو ختم کر کے ہی دم لیتا ہے، بے دینی اور دین بے زاری کے سیل رواں کا بنیادی پتھر یہی مغربی یا دیگر اسلام دشمن طاقتوں کا یلغار ہے۔

نویں وجہ: تبلیغی اکابر کا موقف

تبلیغی جماعت کے بزرگ بانی حضرت مولانا محمد الیاس رحمہ اللہ کو اللہ تعالیٰ نے اس آخری دور میں متعدد خصوصیات سے نوازا تھا، لیکن ان میں سے جو نمایاں وصف تھا وہ "امت کا درد و فکر اور سوز دل" تھا جس کی وجہ سے ان کی زندگی عزیمت وہمت کی تصویر بنی رہی اور آخری سانس تک اسی میں لگے رہے، وہ بھی زندگی بھر اسی میں محو رہے کہ امت کی پستی اور انحطاط کا سبب معلوم کرکے اس کی اصلاح کرے۔ ان کے ہاں اس موجودہ پستی کا اصل سبب کیا تھا؟ اس کی تفصیل "مسلمانوں کی پستی کا واحد علاج" نامی رسالے سے معلوم کی جاسکتی ہے جو ان کے حکم وارشاد پر ان ہی کے ایک خادم حضرت مولانا احتشام الحسن کاندھلوی صاحب رحمہ اللہ نے تحریر فرمایا ہے، وہ اس رسالہ کے شروع میں تحریر فرماتے ہیں:

"ہماری اِس پستی اور اِنحطاط کے مُختلف اَسباب بیان کیے جاتے ہیں، اور اُن کے اِزالے کی مُتعدِّد تدابیر اِختیار کی گئیں؛ لیکن ہر تدبیر ناموافق وناکام ثابت ہوئی، جس کے باعث ہمارے رہبر بھی یاس وہراس میں گِھرے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ، اب تک ہمارے مرض کی تشخیص ہی پورے طور پر نہیں ہوئی، یہ جو کچھ اَسباب بیان کیے جاتے ہیں اصل مرض نہیں؛ بلکہ اُس کے عَوارِض ہیں؛ پس تاوقتے کہ اصل مرض کی جانب توجُّہ نہ ہوگی اور مادۂ حقیقی کی اصلاح نہ ہوگی، عَوارِض کی اِصلاح ناممکن اور مُحال ہے؛ پس جب تک کہ ہم اصل مرض کی ٹھیک تشخیص اور اُس کا صحیح علاج معلوم نہ کرلیں ہمارا اصلاح کے بارے میں لَب کُشائی کرنا سخت ترین غلطی ہے"۔

اس کے بعد ایک بہت کام کی بات ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"ہمارا یہ دعویٰ کہ ہماری شریعت ایک مکمل قانونِ الٰہی ہے جو ہماری دینی اور دنیوی فلاح و بہبود کا تاقیامِ قیامت ضامن ہے، پھر کوئی وجہ نہیں کہ ہم خود ہی اپنا مرض تشخیص کریں اور خود ہی اِس کا علاج شروع کردیں؛ بلکہ ہمارے لیے ضروری ہے کہ ہم قرآنِ حکیم سے اپنا اصل مرض معلوم کریں، اور اِسی مرکزِ رُشد و ہدایت سے طریقِ علاج معلوم کرکے اُس پر کاربند ہوں۔ جب قرآنِ حکیم قیامت تک کے لیے مکمل دستورُ العمل ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ اِس نازک حالت میں ہماری رہبری سے قاصر رہے"۔

اس کے بعد درج بالا نکتہ کے مطابق قرآن وحدیث کی روشنی میں اصل مرض کی تشخیص کرتے ہوئے رقم طراز ہے:

"مالکِ ارض و سماء جلّ وعَلَا کا سچا وعدہ ہے کہ: رُوئے زمین کی بادشاہت وخلافت مومنوں کے لیے ہے:

﴿وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ﴾

ترجمہ: "اللہ تعالیٰ نے وعدہ کیا ہے اُن لوگوں سے جو تم میں سے ایمان لائے اور اُنھوں نے عمل صالح کیے، کہ اُن کو ضرور رُوئے زمین کا خلیفہ بنائے گا"۔

اور یہ بھی اطمینان دلایا ہے کہ، مومن ہمیشہ کُفّار پر غالب رہیں گے، اور کافروں کا کوئی یار و مددگار نہ ہوگا:

﴿وَلَوْ قٰتَلَكُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوَلَّوُا الْأَدْبَارَ ثُمَّ لَا يَجِدُوْنَ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا﴾[1]

ترجمہ: "اور اگر تم سے یہ کافر لڑتے تو ضرور پیٹھ پھیر کر بھاگتے، پھر نہ پاتے کوئی یار و مددگار"۔

---

[1] الفتح،ع ۲ ،آیۃ ۲۲.

﴿وَكَانَ حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِيْنَ﴾[1]

ترجمہ: اور حق ہے ہم پر مدد ایمان والوں کی"۔

﴿وَلَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ﴾ [2]

ترجمہ: "اور تم ہمت مت ہارو اور رنج مت کرو، اور غالب تم ہی رہوگے اگر تم پورے مومن رہے"۔

﴿وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ﴾ [3]

ترجمہ: "اور اللہ ہی کی ہے عزت اور اُس کے رسول ﷺ کی اور مسلمانوں کی"۔

مذکورہ بالا اِرشادات پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ، مسلمانوں کی عزت، شان وشوکت، سربلندی وسرفرازی اور ہر برتری وخوبی اُن کی صفتِ ایمان کے ساتھ وَابستہ ہے، اگر اُن کا تعلّق خدا اور رسول ﷺ کے ساتھ مُستحکم ہے (جو ایمان کا مقصود ہے) تو سب کچھ اُن کا ہے، اور اگر خدانہ خواستہ اِس رَابطہ، تعلُّق میں کمی اور کمزوری پیدا ہوگئی ہے تو پھر سراسر خُسران اور ذِلّت وخواری ہے، جیسا کہ واضح طور پر بتلادیا گیا ہے:

﴿وَالْعَصْرِ، إِنَّ الإِنْسَانَ لَفِيْ خُسْرٍ، إِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوْا الصّٰلِحٰتِ، وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ، وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ﴾[4]

---

[1] الرّوم،ع:۵،آیۃ ۴۷۔

[2] آل عمران،ع:۱۴، آیۃ ۱۳۹۔

[3] منافقون،ع:۱، آیۃ ۸۔

[4] سورۃ العصر،سورۃ ۱۰۳۔

ترجمہ: "زمانہ کی قسم ہے بیشک انسان گھاٹے میں ہے مگر جو لوگ ایمان لائے اور نیک کام کیے اور حق پر قائم رہنے کی اور صبر کرنے کی آپس میں وصیت کرتے رہے"۔

ہمارے اَسلاف عزت کے مُنتہا کو پہنچے ہوئے تھے اور ہم اِنتہائی ذِلّت وخواری میں مبتلا ہیں؛ پس معلوم ہوا کہ وہ کمالِ ایمان سے مُتّصِف تھے اور ہم اِس نعمتِ عُظمیٰ سے محروم ہیں، جیسا کہ مُخبِرِ صادق ﷺ نے خبر دی ہے:

سَيَأْتِيْ عَلَى النَّاسِ زَمَانٌ لَايَبْقٰى مِنَ الإِسْلَامِ إِلَّا اسْمه، وَلَامِنَ الْقُرْاٰنِ إِلَّا رَسْمه.

ترجمہ: "یعنی: قریب ہی ایسا زمانہ آنے والا ہے کہ اسلام کا صرف نام باقی رہ جائے گا، اور قرآن کے صرف نُقوش رہ جائیں گے"۔

یہاں تک کی عبارت سے مؤلف کا موقف معلوم ہوا، اور یہ بات واضح ہوگئی کہ ان کے نزدیک امت کے زوال وانحطاط کا اصل سبب کیا ہے؟ اب سوال یہ ہوتا ہے کہ اس کھوئی ہوئی عزت وسیادت کو کیونکر بحال کیا جاسکتا ہے، آگے اسی کے متعلق لکھتے ہیں:

"اب غور طلب امر یہ ہے کہ، اگر واقعی ہم اِس حقیقی اسلام سے محروم ہوگئے جو خدا اور رسول ﷺ کے یہاں مَطلُوب ہے، اور جس کے ساتھ ہماری دِین ودنیا کی فَلاح وبہبود وابَستہ ہے، تو کیا ذریعہ ہے جس سے وہ کھوئی ہوئی نعمت واپس آئے؟ اور وہ کیا اسباب ہیں جن کی وجہ سے رُوحِ اسلام ہم میں سے نکال لی گئی، اور ہم جَسَدِ بے جان رہ گئے؟ جب مُصحفِ آسمانی کی تلاوت کی جاتی ہے اور (اُمّت محمدیہ ﷺ) کی فضیلت اور برتری کی عِلّت وغایت ڈھونڈی جاتی ہے، تو معلوم ہوتا ہے کہ اِس اُمّت کو ایک اعلیٰ اور برتر کام سپرد کیا گیا تھا، جس کی وجہ سے "خَيْرُ الأُمَم" کا مُعزّز خِطاب اِس کو عطا کیا گیا۔ دنیا کی پیدائش کا مقصدِ اصلی خدا وَحْدَہٗ لَاشَرِیکَ لَہٗ

کی ذات وصفات کی معرفت ہے، اور یہ اُس وقت تک ناممکن ہے کہ جب تک بنی نوعِ انسان کو بُرائیوں اور گندگیوں سے پاک کر کے بھلائیوں اور خوبیوں کے ساتھ آراستہ نہ کیا جائے، اِسی مقصد کے لیے ہزاروں رسول اور نبی بھیجے گئے، اور آخر میں اِس مقصد کی تکمیل کے لیے سیّدُ الانبیاءِ وَالمرسلین ﷺ کو مبعوث فرمایا، اور ﴿اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ﴾ کا مژدہ سنایا گیا؛ اب چوں کہ مقصد کی تکمیل ہو چکی تھی، ہر بھلائی اور بُرائی کو کھول کھول کر بیان کر دیا گیا تھا، ایک مکمّل نظامِ عمل دیا جاچکا تھا؛ اِس لیے رِسالت ونُبوّت کے سلسلے کو ختم کر دیا گیا، اور جو کام پہلے نبی اور رسول سے لیا جاتا تھا وہ قیامت تک (اُمّتِ محمدیہ ﷺ) کے سُپُرد کر دیا گیا۔"

اس کے بعد اپنے دعویٰ پر قرآن وسنت کے کچھ نصوص ذکر کرنے کے بعد تحریر فرماتے ہیں:

"احادیثِ مذکورہ پر غور کرنے سے یہ بات معلوم ہوئی کہ، اَمر بالمعروف ونَہی عَنِ المنکر کو چھوڑنا خداوَحدَہٗ لَاشریکَ لَہٗ کی لعنت اور غضب کا باعث ہے، اور جب اُمّتِ محمدیہ ﷺ اِس کام کو چھوڑ دے گی تو سخت مَصائب وآلام اور ذِلّت وخواری میں مُبتلا کر دی جائے گی، اور ہر قسم کی غیبی نصرت ومدد سے محروم ہو جائے گی؛ اور یہ سب کچھ اِس لیے ہوگا کہ اُس نے اپنے فرضِ منصبی کو نہیں پہچانا، اور جس کام کی اَنجام دَہی کی جو ذمہ دار تھی اُس سے غافل رہا۔ یہی وجہ ہے کہ نبیٔ کریم ﷺ نے اَمر بالمعروف ونَہی عَنِ المنکر کو ایمان کا خاصّہ اور اُس کے چھوڑنے کو ایمان کے ضُعف واِضمحلال کی علامت بتلایا۔۔۔ اَفسوس صد افسوس! جو خطرہ تھا وہ سامنے آگیا، جو کھٹکا تھا آنکھوں نے دیکھ لیا۔"[1]

---

[1] مسلمانوں کی پستی کا واحد علاج، فضائل اعمال، ص ۷۹۱.

مزید وجوہات و توجیہات:

اس کے علاوہ بھی متعدد اہل فکر و نظر نے اس سوال کے جواب سے عہدہ براں ہونے کی کوششیں فرمائی ہیں، یہاں نمونہ کے طور پر مزید چند مفکرین کے آراء ذکر کئے جاتے ہیں جس کا ایک فائدہ قارئین کو یہ حاصل ہو جائے گا کہ زیر بحث موضوع سے متعلق مختلف زاویے اس کے سامنے آجائیں گے، افکار و خیالات کے متعدد دریچے کھل جائیں گے اور گزرے لوگوں کے بیسیوں سالوں کے تجربات سے چند لمحات میں استفادہ کرنے کا موقع ہاتھ آجائے گا۔

مفکر شکیب ارسلان مرحوم کی رائے:

آپ نے ایک سوال کے جواب میں خاص اس موضوع پر ایک تفصیلی تحریر فرمایا تھا، جو اردو میں "اسباب زوال امت" کے نام سے شائع ہوا، اس میں آپ نے اس امت مسلمہ کے موجودہ انحطاط و زوال کے درج ذیل دس اسباب ذکر فرمائے ہیں:

۱: جانی اور مالی جہاد سے پہلو تہی۔

۲: اپنے دین و قوم سے غداری اور دشمنوں سے وفاداری

۳: جہالت

۴: کم علمی۔ ان دونوں میں وہ یہ فرق کرتے ہیں کہ جہالت کا مطلب تو بالکل کچھ نہ جاننا ہے یعنی دین کے معاملہ میں بالکل ناواقفِ محض رہے جبکہ کم علمی کا مطلب ادھورا علم اور ناقص معلومات ہیں اور یہ چیز جہالت کی بنسبت زیادہ مضر ثابت ہوتی ہے چنانچہ مشہور ہے کہ نیم حکیم خطرہ جان اور نیم ملا خطرہ ایمان است۔

۵: (اچھے اسلامی) اخلاق (وعادات) کا زوال۔

۶: علماء اور حکمرانوں کا زوال

۷: درد ناک بزدلی اور مایوسی

۸: الحاد پروری اور قدامت پسندی

۹، ۱۰: اسلامی تہذیب اور مذہب سے بدگمانی۔[1]

مولانا احمد علی لاہوری صاحبؒ کا تجزیہ

آپ ہندوستان کے ان بڑے اہل علم میں سے ایک ہے جن کی زندگیوں کا ایک بڑا حصہ تحریکات میں گزرا، آپ فرماتے ہیں کہ مسلمانوں کی موجودہ بے دینی کے تین بڑے اسباب ہیں:

۱: غلط تعلیم (نصاب اور نظام، دونوں میں بنیادی خامیاں پائی جاتی ہیں جن کی وجہ سے پوری امت میں بے مختلف سطحوں پر دینی اور دین بے زاری کی فضاء عام ہو رہی ہے۔)

۲: بے دین لوگوں کی صحبت (اجتماعی اور انفرادی دونوں قسم کی زندگی میں اس وقت بے دین لوگوں کے ساتھ صحبت و تعلق کی فضاء عام ہے۔)

۳: حرام یا مشتبہ مال (اس کی بھی ہر طرف فراوانی ہے۔)[2]

جناب اسرار عالم صاحب مرحوم کی رائے:

آپ نے اپنی کتاب "اسلام اور اکیسویں صدی کا چیلنج" میں اسی نوعیت کے ایک سوال کا تفصیلی جواب دیا ہے۔ سوال یہ تھا کہ اس وقت مسلمان جو ہر لحاظ سے "فتنہ جدیدہ" یعنی فتنہ مغرب کے شکار ہوئے تو اس کی توجہ کیا ہے؟ اور کن اسباب کی وجہ سے یہ بھیانک نتیجہ

---

[1] ملاحظہ فرمائیں: ان کا رسالہ "اسباب زوال امت" دعوۃ اکیڈمی بین الاقوامی یونیورسٹی اسلام آباد

[2] اس ناکارہ نے حضرت کا یہ تجزیہ ان کی امالی پر مشتمل نئی مطبوعہ تفسیر "تفسیر لاہوری" میں پڑھی ہے اور وہی سے اس کو اپنے پاس محفوظ کیا ہے، لیکن اس وقت حوالہ مستحضر نہیں ہے۔

سامنے آیا؟ اس کے جواب میں آپ نے تین اسباب متعین کئے ہیں اور لکھا ہے کہ ان تین اسباب کی وجہ سے مسلمانوں کو اس ذلت وانحطاط کا شکار ہونا پڑا ہے۔

۱: کتاب وسنت پر پوری طرح کار بند نہ ہونا۔ ۲: عجلت پسندی اور فیصلوں میں احتیاط نہ کرنا۔ ۳: معاصر طاغوتی افکار سے مغلوبیت۔

آپ تحریر فرماتے ہیں:

"اس سلسلے میں فی زمانہ تین ہی باتیں نظر آتی ہیں جنہیں اسباب قرار دیا جاسکتا ہے:

۱: تمسک بالکتاب والسنۃ کا حق ادا نہ ہونا: دور سے خوش گمان ہونے حسن ظن کے ساتھ کسی قول وعمل کی غیر ضروری تاویل کرنے کی بجائے نزدیک جاکر بنظر غائر دیکھنے اور پرکھنے سے یہ بات بسا اوقات سامنے آتی ہے کہ عصر حاضر میں بعض ملکوں کی تحریکاتِ اسلامی میں تمسک بالکتاب والسنۃ کے مطلوبہ معیار کا لحاظ رکھنے سے متعلق کوتاہی ہو رہی ہے، اور بعض تحریکی افراد واجتماعیات اسلام اور مسلمانوں کے تعلق سے مخلصانہ ہی سہی مگر عصر حاضر کی بعض بظاہر غیر معمولی موثر چیزوں، باتوں، کارکردگیوں اور اداروں سے متاثر ہو کر کتاب وسنت اور اس کے احکامات کے تعلق سے دور از کار تاویلات کرکے ہدایت حاصل کرنے کی طرف مائل نظر آتی ہیں۔

۲: عجلت پسندی: اس فتنہ جدید سے متاثر ہو جانے کے پیچھے دوسرا سبب عجلت پسندی نظر آتا ہے بعض اوقات عجلت کے پیچھے شدت شوق کا معصومانہ جذبہ کارفرما ہوتا ہے۔ شدت شوق بجائے خود کوئی بری شے نہیں لیکن بعض اوقات شدت شوق بے لگام ہو جاتی ہے، اور انسان یا جمعیتیں اپنے فیصلے ایسے امور کو مد نظر رکھ کر کرنا شروع کر دیتی ہیں جو حقائق کے بجائے مفروضے ہوتے ہیں اور محض شدت شوق ان کی ایسی تعبیر کرتی ہے کہ وہ حقائق نظر آنے لگتے ہیں، لیکن ہمیشہ ایسا نہیں ہوتا، کبھی جرات واستقامت کی کمی، عزیمت سے فرار اور کبھی دلوں کے امراض عجلت پسندی کی طرف اس طرح مائل کرتے ہیں کہ انسان کو شدتِ شوق کی تصویر نظر آتا ہے۔

۳: معاصر طاغوتی افکار سے مغلوبیت: فتنہ جدید میں آلودگی کا تیسرا سبب ھدی للناس پر یقین اور عقیدہ ہونے کے باوجود بینٰت من الھدی والفرقان میں رسوخ نہ ہونا جو معاصر طاغوتی افکار، رجحانات، حکمتِ عملی اور رَوِش سے مغلوبیت کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے، جس کا لازمی نتیجہ مداہنت کا ظہور اور رواج پانا ہے، عہدِ حاضر میں مغربی افکار، رجحانات حکمت عملی اور ان کے اداروں سے مرغوبیت ہوشے ہے جسے طاغوتی افکار سے مغلوبیت کا نام دیا جاسکتا ہے۔"

اس کے بعد ایک تلخ حقیقت ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"تحریک اسلامی کے بعض افراد اور ایسے افراد پر مشتمل بعض حلقے مغربی افکار و نظریات تہذیب وثقافت، قوت وٹیکنالوجی وغیرہ سے کچھ اس درجہ مغلوب ہیں کہ اپنی عملی زندگی میں مغرب کی بظاہر مخالفت کرتے ہوئے بھی ان کے دلوں پر مغرب کا سحر چھایا ہوا ہے اور وہ مغربی افکار، تہذیب وثقافت، قوت ٹیکنالوجی اور اداروں کو اسلامی لبادہ اوڑھا کر بلا کم وکاست درآمد کرلینے کو ہی اسلامی تحریک کا نصب العین سمجھتے ہیں، ان کی دلوں کی یہ سحر زدگی بعض اوقات انہیں جس تبدیلی کے لانے کی طرف لے جاتی ہے یا جس درجہ کی تبدیلی پر انہیں بس کرنے اور قانع ہوجانے پر آمادہ کرلیتی ہے وہ جاہلیت خاصہ کو اسلامی جیسا لباس میں پیش کرنے کے سوا کچھ نہیں۔"[1]

ان اسباب کا تجزیہ و تحلیل

یہ حقیر تو اس قابل نہیں ہے کہ عالم اسلام کے مسائل ومشکلات کا صحیح اور درست تصفیہ کرسکے اور نہ ہی اس خوش فہمی میں مبتلا ہے کہ وہ کوئی ایسا صاحب فکر و نظر ہے جو ان جیسے عالمگیر مسائل کے حل کرنے کی لیاقت رکھتا ہو یا گزرے ہوئے اور معاصر مفکرین کے افکار وآراء میں کوئی معمولی اضافہ کرسکے۔ البتہ یہ موضوع اس کے لئے کوئی اجنبی

---

[1] اسلام اور اکیسویں صدی کا چیلنج ص ۱۰۷ تا ۱۱۴۔

نہیں ہے بلکہ ایک طویل عرصہ سے اس پر خیال آزمائی کرتا رہا ہے اور اس حوالے سے دیگر مفکرین کو پڑھنے اور سمجھنے کی بھی کوشش کرتا رہا ہے اور ساتھ اس بات پر اس گناہ گار کو پختہ یقین اور غیر متزلزل اعتقاد تھا کہ ہمارے پیارے رسول مکرم ﷺ نے اس جیسے اہم موقع اور تاریخ کے نازک موڑ پر ضرور ہماری کوئی رہنمائی فرمائی ہو گی، ایسا نہیں ہو سکتا کہ ان جیسے گھمبیر اور مایوس کن گھڑی میں ہمیں یتیم و بے کس چھوڑ دیا گیا ہو جو دوسرے کے دستِ نگر کا محتاج و ذلیل ہو، اس یقین کی وجہ سے متعلقہ موضوع سے وابستہ نصوص کی بھی تلاش کرتا رہا۔

اس تھوڑی بہت مناسبت کے بل بوتے پر وہ اہل فکر و نظر کی خدمت میں چند طفلانہ باتیں اس جذبے سے رکھتا ہے کہ اگر اس کی کسی گوشے میں کام کا کوئی پہلو نکلے تو وہ امت کے کام اور اگر نہ ہو تو دیگر بہت سی باتوں کی طرح یہ بھی ردی کے ڈھیر کا ایک حصہ بن جائے۔ ذیل میں اسی جذبے کے ساتھ چند باتیں ذکر کی جاتی ہیں۔

الف: حقیقت یہ ہے کہ ان میں سے بہت سے اسباب ایک دوسرے کے قریب ہیں بلکہ بعض تو ایسے ہیں جن کا آپس میں تداخل یا ترادف کا تعلق معلوم ہوتا ہے، چنانچہ وجہ نمبر ۲ (دین اسلام کے تقاضوں پر نہ چلنا)، وجہ نمبر ۵ (قرآن و سنت کو پس پشت ڈالنا)، اور ساتویں وجہ (اسلاف کی میراث کھونا) تقریباً مترادف ہیں۔ اسی طرح چوتھی اور آٹھویں وجہ کے درمیان بھی تداخل کا تعلق معلوم ہوتا ہے۔

ب: یہ سب اسباب ووجوہات اپنی جگہ درست ہیں اور اس میں شبہ نہیں ہے کہ بے دینی کے فروغ میں اور دین بے زاری کے فضاء عام ہونے میں ان اسباب کا واقعی کردار ہو سکتا ہے اور ہے۔ لیکن ان جیسے تمام اسباب ووجوہات اگر تنقیح وتہذیب کے عمل سے گزار کر

ان کی تلخیص کی جائے اور کسی جامع عنوان کے تحت ان سب کو پرونے اور جمع کرنے کی کوشش کی جائے تو اس کے لئے "امت کی اکثریت کا دینی احکام وہدایات سے اعراض وروگردانی کرنا" مناسب عنوان معلوم ہوتا ہے۔

انفرادی طور پر جب دین وشریعت کے احکام سے یوں غفلت کا رویہ برتنا شروع ہوا، تو اللہ تعالیٰ کی نصرت وتائید سے محرومی گلے کا طوق بن گیا، یہیں سے سیاسی زوال شروع ہوا، حکومت وسیادت کی بھاگ ڈور ہاتھ سے نکل گئی جس کی وجہ سے اغیار مسلط ہوئے اور انہوں نے اپنے ساتھ اپنے نظریات واعتقادات کو بھی لطائف الحیل کے ساتھ ہمارے سروں پر مسلط کرنا شروع کیا جو کچھ ہی عرصہ بعد ہمارے دل وجان کا حصہ بن گئی اور یوں رفتہ رفتہ ہم ان کی رنگ میں رنگتے چلے گئے اور گزرتے گزرتے علامہؒ اقبال مرحوم کے اس شعر کے صحیح مصداق ٹھہر گئے جو انہوں نے "جواب شکوہ" میں کہا ہے:

شور ہے، ہو گئے دنیا سے مسلماں نابود
ہم یہ کہتے ہیں کہ تھے بھی کہیں مسلم موجود؟
وضع میں تم ہو نصاریٰ تو تمدن میں ہنود
یہ مسلماں ہیں جنہیں دیکھ کے شرمائیں یہود

اس تجزیہ پر مفید اشکال وجواب

اس پر بجا طور پر یہ اشکال کیا جاسکتا ہے کہ سوال یہ ہوا تھا کہ موجودہ بے دینی اور دین بے زاری کے فضاء عام ہونے کی وجہ کیا ہے؟ اور آپ اس کا یہ جواب دیتے ہیں کہ اکثریت کا دین وشریعت کے احکام سے غفلت برتنا اور اعراض کرنا تو اس سے سوال کا جواب کیونکر ہو سکتا ہے! اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ جو سبب ہے وہی مسبب ہے، حالانکہ

سبب اور چیز ہوتی ہے اور مسبب الگ۔ سبب سے مسبب تک رسائی ہوتی ہے تو دونوں چیزوں کا الگ الگ ہونا ضروری ہے، ایک ہی چیز سبب بھی ہے اور وہی اسی لحاظ سے مسبب بھی ہو، یہ غلط ہے، لہٰذا یہ جواب کیونکر درست ہو سکتا ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ دونوں چیزوں میں فرق ہے، انفرادی طور پر اکثریت نے دینی احکام وہدایات کے متعلق غفلت برتنا شروع کر دیا اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اجتماعی طور پر دین بے زاری کی فضاء عام ہو گئی۔ انفرادی طور پر شروع شروع میں جو غفلت کا رویہ برتا جانے لگا، وہ دین کے چھت کے نیچے تھا اور ظاہری طور پر دینی تسلط یا کم از کم مسلمانوں کی سیادت وقیادت قائم تھی اور اس کے نتیجے میں جس دین بے زاری کی بات کی جاتی ہے وہاں وہ دینی چھت ہی قائم نہیں ہے۔

معاصر ذہن کی بے اطمینانی

اس تحقیق و تشخیص پر معاصر ذہن مطمئن نہیں ہوتا، اس کی بے اطمینانی کی بڑی وجہ یہ ہوتی ہے کہ وہ ان جیسی باتوں کو مذہبی خوش فہمی سمجھتا ہے اور یہ خیال کرتا ہے کہ کہنے والا چونکہ پہلے سے مذہب کے بارے میں بے جا طور پر نیک گمان رکھتا ہے، اس لئے وہ عقل وفکر سے کام لئے بغیر ایک گونہ تعصب و مجبوری کی وجہ سے اس قسم کی توجیہات کرتا ہے۔ یہاں خیر خواہی اور بھائی چارگی کے جذبے سے اس بات کا جائزہ لینے کی کوشش کی جاتی ہے۔

دعویٰ کے دلائل

ہم پورے وثوق اور اعتماد کے ساتھ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ مسلمانوں کے عروج وزوال اور ان کی ترقی و تنزل میں دینداری اور بے دینی کا بڑا مؤثر کردار ہوتا ہے، یہ ایک مسلم

حقیقت ہے، محض خوش فہمی نہیں ہے۔ درج ذیل سطور میں تین پہلوؤں سے اس بات کو واضح کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ ۱: مذہبی نقطہ نظر سے۔ ۲: تاریخی تناظر میں۔ ۳: عقلی وفکری لحاظ سے۔

مذہبی نقطہ نظر سے

دین اسلام کی بنیاد قرآن وسنت اور ان کے نصوص پر ہے اور بیسیوں نصوص میں یہ مفہوم متنوع انداز میں بیان کیا گیا ہے جن کا قدر مشترک یہ ہے کہ مسلمانوں کی ترقی وتنزل صرف مادی وظاہری اسباب ہی کی مرہون منت نہیں ہوتی بلکہ اس میں دین ومذہب کے ساتھ لگاؤ کی نوعیت کا بھی خاصا دخل ہوتا ہے۔ یہاں مثال کے طور پر چند نصوص ذکر کئے جاتے ہیں اور ساتھ ان سے استدلال کرنے کا طریقہ بھی بتایا جائے گا۔

پہلی اور دوسری آیت:

سورۃ مائدہ میں فرمان خداوندی ہے:

﴿فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِيثَاقَهُمْ لَعَنَّاهُمْ وَجَعَلْنَا قُلُوبَهُمْ قَاسِيَةً يُحَرِّفُونَ الْكَلِمَ عَنْ مَوَاضِعِهِ وَنَسُوا حَظًّا مِمَّا ذُكِّرُوا بِهِ وَلَا تَزَالُ تَطَّلِعُ عَلَى خَائِنَةٍ مِنْهُمْ إِلَّا قَلِيلًا مِنْهُمْ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاصْفَحْ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ﴾[1]

ترجمہ: "پھر ان کی عہد شکنی کے باعث ہم نے ان پر لعنت کی اور ان کے دلوں کو سخت کر دیا وہ لوگ کلام کو اسکے ٹھکانے سے بدلتے ہیں اور اس نصیحت سے

---

[1] المائدۃ: آیۃ ۱۳۔

نفع اٹھانا بھول گئے جو انہیں کی گئی تھی اور تو ہمیشہ ان کی کسی نہ کسی خیانت پر اطلاع پاتا رہے گا مگر تھوڑے ان میں سے، سو انہیں معاف کر اور درگزر کر بیشک اللہ نیکی کرنے والوں کو پسند کرتا ہے"۔

﴿وَمِنَ الَّذِينَ قَالُوا إِنَّا نَصَارَىٰ أَخَذْنَا مِيثَاقَهُمْ فَنَسُوا حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوا بِهِ فَأَغْرَيْنَا بَيْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَاءَ إِلَىٰ يَوْمِ الْقِيَامَةِ وَسَوْفَ يُنَبِّئُهُمُ اللَّهُ بِمَا كَانُوا يَصْنَعُونَ﴾[1]

ترجمہ: "اور جو لوگ اپنے آپ کو نصاریٰ کہتے ہیں ان سے بھی ہم نے عہد لیا تھا پھر وہ اس نصیحت سے نفع اٹھانا بھول گئے جو انہیں کی گئی تھی پھر ہم نے ان کے درمیان ایک دوسرے سے دشمنی اور بغض قیامت تک کے لیے ڈال دیا اور اللہ ان کا کیا ہوا انہیں جتلا دے گا"۔

پہلی آیت میں یہودیوں کے ملعون ہونے اور سخت دل ہو جانے کی وجہ یہ بیان کی گئی ہے کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ کئے ہوئے وعدے کو توڑ ڈالا تھا۔ اور دوسری آیت میں یہ سبق دیا گیا ہے کہ جب نصاریٰ نے اپنے دین کا کچھ حصہ بھلا کر رکھا تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کے درمیان بغض و عداوت ڈالدی گئی جو قیامت تک ان کے گلے کا ہار بنا رہے گا۔

تیسری آیت کریمہ:

﴿وَلَا تَهِنُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَنتُمُ الْأَعْلَوْنَ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ﴾

---

[1] المائدۃ: آیۃ ۱۴۔

ترجمہ: "اور سست نہ ہو اور غم نہ کھاؤ اور تم ہی غالب رہو گے"۔

یہاں مسلمانوں کے غالب ہونے کو ایمان کے ساتھ مشروط کیا گیا ہے کہ اگر تم مؤمن
ہوں تو تمہیں اوپر رہو گے۔ 13

چوتھی آیت مبارکہ:

﴿إِنْ يَنْصُرْكُمُ اللهُ فَلَا غَالِبَ لَكُمْ وَإِنْ يَخْذُلْكُمْ فَمَنْ ذَا الَّذِي يَنْصُرُكُمْ مِنْ بَعْدِهِ وَعَلَى اللهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُونَ﴾

ترجمہ: "اگر اللہ تمہاری مدد کرے گا تو تم پر کوئی غالب نہ ہو سکے گا اور اگر اس نے مدد چھوڑ دی تو پھر ایسا کون ہے جو اس کے بعد تمہاری مدد کر سکے اور مسلمانوں کو اللہ ہی پر بھروسہ کرنا چاہیے"۔

اور سورۃ حج میں فرمان ربانی ہے:

﴿وَلَيَنْصُرَنَّ اللهُ مَنْ يَنْصُرُهُ إِنَّ اللهَ لَقَوِيٌّ عَزِيزٌ﴾

ترجمہ: "اور اللہ ضرور اس کی مدد کرے گا جو اللہ کی مدد کرے گا بیشک اللہ زبردست غالب ہے"۔

ان دو آیتوں سے معلوم ہوا کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کے دین کی نصرت وخدمت کرتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کی نصرت فرماتے رہیں گے اور جس شخص کی نصرت اللہ تعالیٰ کرے، اس پر کسی کا غالب آنا متصور نہیں ہو سکتا، اور جو شخص اس کی نصرت واعانت سے

آل عمران: آیة ۱۳۹.

آل عمران: آیة ۱۶۰.

الحج: آیة ۴۰.

محروم ہو، وہ مغلوب ہی ہو گا۔ یہ صرف اشخاص وافراد ہی کا مسئلہ نہیں ہے بلکہ اقوام وملل کا بھی یہی قضیہ ہے۔

پانچویں آیت کریمہ:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنْ تَنْصُرُوا اللَّهَ يَنْصُرْكُمْ وَيُثَبِّتْ أَقْدَامَكُمْ ۝ وَالَّذِينَ كَفَرُوا فَتَعْسًا لَهُمْ وَأَضَلَّ أَعْمَالَهُمْ ۝ ذَلِكَ بِأَنَّهُمْ كَرِهُوا مَا أَنْزَلَ اللَّهُ فَأَحْبَطَ أَعْمَالَهُمْ ۝ أَفَلَمْ يَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَيَنْظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ دَمَّرَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ وَلِلْكَافِرِينَ أَمْثَالُهَا ۝ ذَلِكَ بِأَنَّ اللَّهَ مَوْلَى الَّذِينَ آمَنُوا وَأَنَّ الْكَافِرِينَ لَا مَوْلَى لَهُمْ﴾[1]

ترجمہ: اے ایمان والو اگر تم اللہ کی مدد کرو گے وہ تمہاری مدد کرے گا اور تمہارے قدم جمائے رکھے گا اور جو منکر ہیں سو ان کے لیے تباہی ہے اور وہ ان کے اعمال اکارت کر دے گا یہ اس لیے کہ انہیں نے ناپسند کیا جو اللہ نے اتارا ہے سو اس نے ان کے اعمال ضائع کر دیے کیا انہوں نے زمین میں سیر نہیں کی کہ وہ دیکھتے ان کا انجام کیسا ہوا جو ان سے پہلے تھے اللہ نے انہیں ہلاک کر دیا اور منکروں کے لیے ایسی ہی (سزائیں) ہیں یہ اس لیے کہ اللہ ان کا حامی ہے جو ایمان لائے اور کفار کا کوئی بھی حامی نہیں۔

نصوص سے حاصل ہونے والے فوائد

ان آیات سے درج ذیل باتیں معلوم ہوتی ہیں:

---

[1] محمد: آیۃ۷تا ۱۱۔

الف: جو شخص یا قوم دین کی نصرت کرتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کی نصرت بھی فرماتے ہیں اور ان کو جنگ کے میدان میں ثابت قدمی کی توفیق بھی عنایت فرماتے ہیں۔

ب: کفر کی وجہ سے اعمال میں وزن برقرار نہیں رہتا، اس لئے کفار کے اعمال نتیجہ خیز نہیں ہوتے۔

ج: کفر ہلاکت کا متقاضی ہے۔

د: اللہ تعالیٰ ایمان والوں کے ساتھ خاص محبت رکھتا ہے جو کفار کو حاصل نہیں ہے اور ظاہر ہے کہ محبت اور خصوصی تعلق کے نتیجہ میں اہل ایمان کو بڑی نعمتیں اور کامیابیاں نصیب ہوں گی جو کفار کو حاصل نہیں ہوسکتیں۔

چند احادیث

پہلی روایت:

عن ابن عمر، قال: سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول: «إذا تبايعتم بالعينة وأخذتم أذناب البقر، ورضيتم بالزرع، وتركتم الجهاد، سلط الله عليكم ذلا لا ينزعه حتى ترجعوا إلى دينكم»[1]

ترجمہ: "حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہے کہ میں نے رسول ﷺ سے یہ باتیں سنی، رسول ﷺ نے فرمایا: جب تم بیعہ عینہ کرنے لگو اور بیلوں کی دم پکڑنے لگو اور تم کھیتی پر راضی ہونے لگو، اور جہاد چھوڑنے

---

[1] سنن أبي داود، كتاب البيوع، باب في النهي عن العينة، ج ۳ ص ۲۷۴.

لگو، تو اللہ تم پر ایسی ذلت مسلط کرے گا کہ وہ ختم نہیں ہوگی، یہاں تک کہ تم واپس دین کی طرف آجاؤ"۔

اس روایت میں چار ایسی امور کی نشاندہی فرمائی گئی جو خود یا ان میں انہماک شرعی نقطہ نظر سے ممنوع ہے اور ساتھ یہ تعلیم دی گئی کہ جب امت ان باتوں کا ارتکاب کر بیٹھے گی تو اس کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ ان پر ذلت ورسوائی مسلط فرمائیں گے، معلوم ہوا کہ دینی احکام پر عمل نہ کرنے سے ذلت ورسوائی مقدر بن جاتی ہے۔ نیز یہ ذلت ورسوائی عام ہے، معاشی، معاشرتی وغیرہ سطح پر بھی ہوسکتی ہے اور سیاسی وتہذیبی زوال بھی اس میں داخل ہے۔ اس کے بعد اس رسوائی سے نکلنے کا جو طریقہ بتایا گیا ہے اس سے بھی درج بالا دعویٰ بالکل صاف ہو جاتا ہے چنانچہ فرمایا کہ جب تک امت اپنے (مکمل) دین پر عمل کرنے کی طرف واپس نہیں لوٹے گی تب تک اللہ تعالیٰ رسوائی کی یہ چادر ان پر سے نہیں ہٹائے گا۔ معلوم ہوا کہ مسلمان قوم کی عزت وشرافت اور سیادت وقیادت میں دین داری کا مؤثر کردار اور اساسی دخل ہے۔

دوسری روایت:

«إن هذا الأمر في قريش لا يعاديهم أحد، إلا اكبه الله على وجهه، ما أقاموا الدين[1]»

ترجمہ: "بے شک امت کی قیادت وامامت کا سہرا قریش میں رہے گا، جو شخص ان سے عداوت کرے گا، اللہ تعالیٰ اس کو اوندھے منہ ڈال دیں گے، جب تک کہ وہ دین پر عمل کرتے رہیں گے"۔

صحيح البخاري، كتاب المناقب، باب مناقب قريش، ج۲ ص۱۴۹.

اس روایت کو یہاں پیش کرنے کی وجہ یہ ہے کہ یہاں یہ بتایا جارہا ہے کہ امت کی قیادت وامامت کا سہرا قریش میں رہے اور جو شخص ان سے عداوت کرے گا، اللہ تعالیٰ اس کو اوندھے منہ ڈال دیں گے۔ قریش کی مخالفت وعداوت پر اس سخت سزا کی وعید مطلق نہیں ہے بلکہ تب تک ہے جب کہ وہ دین کی اقامت کا فریضہ انجام دیتے رہیں گے، اگر کہیں وہ امامت کی کرسی پر ہونے کے باوجود بھی اس اہم فریضہ کے انجام دہی میں غفلت سے کام لیں گے تو ان کے مخالفین کے لئے یہ وعید نہیں ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ قریش جب تک دین کے احیاء وتنفیذ کا کام کریں گے تب تک اللہ تعالیٰ کی نصرت وتائید ان کی رفیق منزل ہوگی اور ایسے حالات میں ان کے مخالفین پر ذلت ورسوائی پڑے گی اور اگر وہ اس اہم کام سے تغافل برتیں گے تو اس غیبی نصرت کا ان سے کوئی وعدہ نہیں ہے۔

تاریخی تناظر میں

تاریخ کے وسیع ذخیرے میں مختلف اقوام وملل کے حالات واطوار کا ذکر موجود ہے ، ان کے اتار چڑھاؤ کے قصص بھی اسی ذخیرے کی زینت ہے، لیکن ہم یہاں دو وجوہات کی بناء پر براہ راست تاریخی ذخیرے کی طرف جانے کی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔

الف: تاریخ اصلا نقل واخبار سے عبارت ہے کہ گزشتہ زمانے میں جو کچھ قصے اور واقعات پیش آئیں ہیں، ان کو ٹھیک ٹھیک ذکر کر دیا جائے۔ رہی یہ بات کہ فلاں کام کیوں ہوا؟ اس کے وجود میں آنے یا لانے کے اصل اسباب وعناصر کیا تھے؟ تو یہ اصلا تاریخ کا حصہ نہیں ہے گو اکثر مؤرخین اس میں خاصی دلچسپی دکھاتے ہیں اور اپنے مزاج ومذاق کے مطابق مختلف واقعات کی توجیہات بھی ساتھ ذکر کرتے رہتے ہیں۔ یاد رہے کہ یہ چیز

اس اہتمام کے باوجود بھی تاریخ کا اصل حصہ نہیں ہے بلکہ مؤرخ کا ذاتی تجزیہ اور قلبی رجحان ہے جس سے اتفاق کرنا ضروری نہیں ہے۔

ب: خود نقل تاریخ میں بھی محدثین کرام کی طرح احتیاط سے کام نہیں لیا گیا، اس لئے تاریخی کتابوں میں درج ہونے والے واقعات بھی یقینی نہیں ہوتے بلکہ بہت سے واقعات ایسے ہیں جو یقین تو کجا، غالب گمان کے مرتبے تک بھی نہیں پہنچتیں۔ ان دونوں وجوہات کی وجہ سے ہم تاریخی کتابوں کی بجائے خود قرآن کریم کی طرف آتے ہیں اور یہاں سے تاریخی تناظر میں جھانکنے کی کوشش کرتے ہیں۔

یوں تو قرآن کریم میں مختلف اقوام وملل کا ذکر کیا گیا ہے لیکن بنی اسرائیل وہ خاص قوم ہے جن کے حالات واطوار سے قرآن کریم نے متعدد جگہوں پر بار بار تعرض فرمایا ہے اور ان کے مختلف نشیب وفراز ذکر فرمائے ہے۔ ان پر ایک طویل دورانیہ ایسے بے سر وسامانی کا بھی گزرا جس میں وہ فرعون اور اس کی قوم کے غلام وخادم تھے، پھر مختلف حالات سے گزر کر ان کو حاکیت وبادشاہت کا منصب نصیب ہوا، رفتہ رفتہ ان میں کچھ عناصر پیدا ہوگئے جن کی وجہ سے ان پر مختلف قومیں مسلط ہوتیں رہی جنہوں نے ان کو بری طرح نقصان پہنچایا اور طرح طرح کے خسارے سے ہم کنار کیا، یہ گویا ان کے جرائم کی قرار واقعی سزا ٹھہری۔

قرآن کریم نے ایک خاص انداز میں ان مختلف حالات کا تذکرہ فرمایا ہے اور ساتھ ان کے اسباب ووجوہات کی طرف بھی اشارات فرمائے ہیں کہ ان کو سیادت وقیادت کیونکر نصیب ہوئی؟ اور کرسی صدارت سے دوسری قوموں کے ہاتھ ذلیل ورسوا ہوجانے کی بنیاد

کیا تھی؟ سورہ بنی اسرائیل کے ابتدائی رکوع میں اس کی کچھ تفصیل ذکر ہے۔ ارشاد خداوندی ہے:

﴿وَقَضَيْنَا إِلَىٰ بَنِي إِسْرَائِيلَ فِي الْكِتَابِ لَتُفْسِدُنَّ فِي الْأَرْضِ مَرَّتَيْنِ وَلَتَعْلُنَّ عُلُوًّا كَبِيرًا فَإِذَا جَاءَ وَعْدُ أُولَاهُمَا بَعَثْنَا عَلَيْكُمْ عِبَادًا لَّنَا أُولِي بَأْسٍ شَدِيدٍ فَجَاسُوا خِلَالَ الدِّيَارِ وَكَانَ وَعْدًا مَّفْعُولًا ثُمَّ رَدَدْنَا لَكُمُ الْكَرَّةَ عَلَيْهِمْ وَأَمْدَدْنَاكُم بِأَمْوَالٍ وَبَنِينَ وَجَعَلْنَاكُمْ أَكْثَرَ نَفِيرًا إِنْ أَحْسَنتُمْ أَحْسَنتُمْ لِأَنفُسِكُمْ وَإِنْ أَسَأْتُمْ فَلَهَا فَإِذَا جَاءَ وَعْدُ الْآخِرَةِ لِيَسُوءُوا وُجُوهَكُمْ وَلِيَدْخُلُوا الْمَسْجِدَ كَمَا دَخَلُوهُ أَوَّلَ مَرَّةٍ وَلِيُتَبِّرُوا مَا عَلَوْا تَتْبِيرًا عَسَىٰ رَبُّكُمْ أَن يَرْحَمَكُمْ وَإِنْ عُدتُّمْ عُدْنَا وَجَعَلْنَا جَهَنَّمَ لِلْكَافِرِينَ حَصِيرًا﴾ [1]

ترجمہ: اور ہم نے بنی اسرائیل کو کتاب میں یہ بات بتلادی تھی کہ تم ضرور ملک میں دو مرتبہ خرابی کروگے اور بڑی سرکشی کروگے، پھر جب پہلا وعدہ آیا تو ہم نے تم پر اپنے بندے سخت لڑائی والے بھیجے پھر وہ تمہارے گھروں میں گھس گئے اور اللہ کا وعدہ تو پورا ہونا ہی تھا، پھر ہم نے تمہیں دشمنوں پر غلبہ دیا اور تمہیں مال اور اولاد میں ترقی دی اور تمہیں بڑی جماعت والا بنادیا، اگر تم نے بھلائی کی تو اپنے ہی لیے کی اور اگر برائی کی تو وہ بھی اپنے ہی لیے کی پھر جب دوسرا وعدہ آیا تاکہ تمہارے چہروں پر رسوائی پھیر دیں اور مسجد میں گھس

---

[1] الإسراء: آية ۴ تا ۸.

جائیں جس طرح پہلی بار گھس گئے تھے اور جس چیز پر قابو پائیں اس کا ستیاناس
کردیں، تمہارا رب قریب ہے کہ تم پر رحم کرے اور اگر تم پھر وہی کروگے تو
ہم بھی پھر وہی کریں گے اور ہم نے دوزخ کو کافروں کے لیے قید خانہ بنایا
ہے"۔

عقلی و فکری لحاظ سے

۱: اقتدار و سلطنت کی بھاگ ڈور جب انسان کے ہاتھ میں آجاتا ہے تو اس سے انسان کے صرف ہاتھ ہی متحرک نہیں ہوتے بلکہ قلب و جگر اور فکر و دماغ بھی برابر حرکت میں آجاتے ہیں، خیالات و خواہشات کی عالم میں طغیانی کا دور دورہ شروع ہو جاتا ہے اور موجوں پر موجیں جنم لیتی رہتی ہیں۔ ان جذبات کی تکمیل انسان کی دلی خواہش کی صورت اختیار کر لیتی ہے حالانکہ اس کی تکمیل میں بسا اوقات بلکہ عام طور پر ظلم و تجاوز تک نوبت جا پہنچتی ہے اور مظلوم خواہ کتنا ہی کمزور و ناتواں کیوں نہ ہو لیکن مزاحمت کی نفسیات سے یکسر عاری نہیں ہوتا بلکہ کسی نہ کسی درجہ میں یہ جذبہ اس کے سینے میں ہوتا ہے اور کچھ نہ ہو تو کم از کم ظالم کی نفرت، بغض اور اس کے ساتھ بدخواہی تو ضرور پیدا ہو جاتی ہے۔ اس طرح متاثر و مظلوم افراد کی تعداد جتنی زیادہ ہوگی، اتنا ہی اقتدار و سلطنت کی بنیادوں میں کیڑے لگنا شروع ہو جائیں گے جو جلد یا بدیر، ناکام و ناپسندیدہ، کمزور سلطنت بنا جائے گا یا بالکل ہی ملیامیٹ ہو جائے گا۔

اگرچہ ان خواہشات کی تکمیل سے عقل و قانون اور فطری شرم و حیاء بھی روک تھام کا کام کر سکتی ہے اور مادی یا سیاسی منافع کے حصول کا اندرون جذبہ بھی سدباب کے کام آسکتا ہے، لیکن پہلے باب میں تفصیل سے ذکر کیا گیا ہے کہ ان عناصر سے جو فوائد حاصل

ہوتے ہیں وہ معیار یا مقدار کے لحاظ سے ناقص اور ادھورے ہی ہوتے ہیں جن سے مطلوبہ فوائد کماحقہ حاصل نہیں کئے جاسکتے۔ ایک مذہب ہی ہے جو اس موقع پر ٹھیک کام آتی ہے اور متوقع اہداف تک معیاری و مثالی صورت میں انسانیت کی رہنمائی کرتی ہے۔ اگر کوئی انسان اندر سے کھوکھلا ہو اور مذہبی جذبات و نظریات سے عاری ہو تو وہ اپنے جذبات کو دلاسا دینے کے لئے ضرور ایسے اقدامات اٹھائے گا جو کسی خاص فرد یا چند افراد کے حق میں ظلم و ناانصافی کے باعث ہوں گے۔

۲: یہ تو حاکم کے دین دار یا اس سے محروم ہونے کے اعتبار سے بات تھی۔ یہی حال دوسری طرف سے بھی ہے چنانچہ اگر محکوم یعنی عوام دین دار ہوں تو ان میں مادی اور دنیوی حرص ولالچ سے ہٹ کر، صبر و تحمل، احسان مندی و شکر، اور خیر خواہی وغیرہ بہت سے ایسی صفات ہوں گی جن کی وجہ سے ان کا آپس میں ربط و تعلق اور حاکم و حکومت کے ساتھ رشتہ پائیدار شکل میں برقرار رہے گا، وہ خود آپس میں بھی امن و خوشی کے ساتھ جیتے رہے گے اور حکومت کے ساتھ بھی دلی احترام و اطاعت کے جذبات کے ساتھ چلیں گے، یوں ایک خوشگوار معاشرہ بن جائے گا۔ ورنہ بصورت دیگر اگر ان کا آپس میں ربط و تعلق اعتدال پر نہ ہو یا حکومت کے ساتھ ان کا ردیہ جارحانہ یا مادی اغراض پر مبنی ہو تو دونوں صورتوں میں حکومت کے لئے درد سر کا سامان ہوگا۔

۳: یہاں جو حاکم اور حکومت کی مثال دی ہے، یہ ایک مثال ہے ورنہ بے دینی کی وجہ سے ملک جس طرح سیاسی زوال و انحطاط کا نذر ہو جاتا ہے یوں ہی تہذیبی، اخلاقی، سماجی اور معاشرتی زوال بھی بے دینی اور دین بے زاری کے نتیجے میں جنم لیتے ہیں اور سیاسی زوال کی بنسبت ان کو سمجھنا زیادہ آسان ہے۔ علامہ زروق فاسی مالکی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

من عز عليه دينه سهل عليه كل شيء، ومن خف عليه دينه صعب عليه كل شيء، وقد قال سري (ض): من عرف الله عاش، ومن مال إلى الدنيا طاش، والأحمق يغدو ويروح في لاش والعاقل عن عيوبه فتاش.۱

ترجمہ: "جس کے دل میں دین کی قدر ہو اسے ہر دینی حکم پر عمل آسان ہوگا۔ جس کے دل میں دین کی قدر نہ ہو اسے ہر حکم، مشکل محسوس ہوگا۔ حضرت سری سقطیؒ فرماتے ہیں کہ: جو اللہ تعالیٰ کو پہچانے وہ زندگی سے لطف اٹھائے گا اور جو دنیا کی طرف متوجہ ہو وہ پریشان حال ہوگا۔ بے وقوف دن رات گزارتا ہے گویا کہ وہ زندہ لاش ہے، جب کہ عقل مند اپنی عیبوں کو تلاش کرتا ہے"۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

---

۱ عدة المريد الصادق، ص: ٢٤٠

باب پنجم:

فصل اول:

مذہب سے متعلق معاصر ذہن کے دس (۱۰) اعتراضات وشبہات کا جائزہ

دین، مذہب اور اسلام کا دائرہ عقیدت ومحبت معیار اور مقدار ہر لحاظ سے بڑھا اور بہت بڑھا ہوا ہے، چنانچہ جو لوگ اس کو ایک بار گلے لگا لیتے ہیں، وہ اس کو بنیادی ضروریات کے درجہ میں سر فہرست رکھتے ہیں جس پر جان کے لین دین تک کے لئے نہ صرف یہ کہ تیار ہوتے ہیں بلکہ اس کو اپنا سرمایہ سعادت اور وسیلہ فخر وعزت شمار کرتے ہیں۔ اسی طرح انسانِ اول حضرت سیدنا آدم علیہ الصلاۃ والسلام سے لے کر ماضی قریب تک تقریباً پوری انسانیت کسی نہ کسی دین ومذہب سے جڑی رہی، اس لئے انسانی نفسیات کا تقاضا یہ ہے کہ جو لوگ اس سے برسرپیکار رہے، وہ اس کے خلاف اشکالات واعتراضات کا ایک وسیع محاذ قائم کریں اور اس باب میں ایڑی چوٹی کا زور صرف کر کے انتھک کوشش کریں، دین ومذہب کے ساتھ یہی معاملہ پیش آیا۔

دین اسلام کا معاملہ بھی اس سے کچھ زیادہ مختلف نہ تھا بلکہ اس کے مخالفین اور معاندین بھی ہر دور میں رہے ہیں، جب سے اسلام کا سورج طلوع ہوا، اس وقت سے لے کر آج تک ہمیشہ افراد کی ایک ضخیم تعداد نے اس کے کرتوں سے اپنے آپ کو محروم کر رکھا ہے، اس لئے دین اسلام کے خلاف زور آزمائی اور طبع آزمائی بھی خوب ہوتی رہی ہے اور اسی لئے اس حوالہ سے اشکالات کا بھی ایک وسیع ذخیرہ تیار ہوا ہے۔

ان اشکالات میں ایک قسم تو ان اشکالات کی ہے جو اسلام یا کسی بھی دین ومذہب کے جزوی مسئلہ سے متعلق ہیں جن کو جزوی اشکالات کہنا مناسب ہے اور دوسری قسم میں وہ اشکالات ہیں جو کسی خاص جزوی مسئلہ سے متعلق نہیں ہوتے بلکہ پورے ہی دینی ڈھانچے سے ان کا تعلق ہوتا ہے، ان سے کسی خاص مسئلہ پر اعتراض واشکال کرنا مقصود نہیں ہوتا بلکہ براہ راست پورے دین کو نشانہ تنقید اور ہدف تردید بنانا مقصود ہے۔ یہاں اسی نوعیت کے اشکالات ذکر کرنا مقصود ہے، اس میں بھی خاص طور پر ان اشکالات کو ذکر کرنے کی کوشش کی گئی ہے جو مغربی تہذیب ومادی تمدن کی بنیاد پر جنم لیتے ہیں۔

پہلا اعتراض: جدید دور میں مذہب کی ضرورت نہیں

انسانیت کے لئے اس وقت دین ومذہب کی ضرورت ہی کیا ہے؟ جو اس کی غلامی کا طوق گلے میں پہنانا ضروری ہو؟ یہ تو قدیم دور کے لئے آیا تھا اور اس وقت کے لحاظ سے مناسب یا نامناسب جیسا کچھ تھا، بس تھا اور زمانے کے ساتھ وہ بھی گزر گیا، اب چونکہ زمانے نے بہت ترقی کی ہے اور سائنس وٹیکنالوجی کے میدان میں انسان خلاء وفضاء عبور کرکے سیاروں اور ستاروں تک جا پہنچا ہے تو اس قدر ترقی یافتہ انسان کے لئے مذہب کی ضرورت ہی کیا ہے؟

انگلینڈ کے ایک سائنس دان "اسٹیفن ہاکنگ" کا یہی خیال مشہور ہے، چنانچہ ان کی نظریات کا ایک ناقد پروفیسر جناب محمد رفعت صاحب لکھتے ہیں:

"تخلیق کائنات کے تصور کے بعد اسٹیفن ہاکنگ خدا کے بارے میں گفتگو کرتا ہے کہ ہمیں خدا کی ضرورت اس وقت تھی جب سائنس نے ترقی نہیں کی تھی اور ہم کائنات کی توجیہ کے لئے خدا

کے تصور کا سہارا لیتے تھے، اب ہم سائنس کے نظریات و حقائق کو جانتے ہیں، اس لئے ہمیں خدا کے تصور کی ضرورت نہیں ہے۔"[1]

جواب:

نہ مذہب کے قدیم ہونے سے انکار ہے اور نہ ہی اس بات میں شبہ ہے کہ زمانہ تبدیل ہو چکا ہے اور اب حضرت انسان نے بہت کچھ عجیب و غریب قسم کی مصنوعات ایجاد کرلی ہے، لیکن ان باتوں کو ملا کر جو نتیجہ نکالا گیا، وہ قطعاً غلط اور بالکل بے بنیاد ہے۔ مذہب کے غیر ضروری ہونے پر یہ استدلال تب درست ہوتا جبکہ پہلے اس بات کا تصفیہ کرلیا جاتا کہ انسان کی زندگی میں دین و مذہب کی ضرورت کیا ہے؟ اور اس بات کی تنقیح کے بعد دلائل سے یہ بات ثابت کی جاتی کہ یہ مقصود چونکہ موجودہ دور میں مذہب کے بغیر بھی پورا ہو جاتا ہے اس لئے مذہب کی کوئی خاص ضرورت نہیں رہی۔

اسی کتاب کے باب اول میں تفصیل کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے کہ مذہب کی ضرورت واہمیت کیوں ہے؟ اور اس کی بنیاد کیا ہے؟ اس کو ایک نظر دوبارہ دیکھ لیا جائے۔ ان مقاصد وفوائد میں سے کوئی چیز ایسی نہیں ہے کہ مذہب کے قدیم ہونے نے اس کو متاثر کیا ہو یا انسانی ایجادات کی بھرمار نے اس میں کوئی خلل ڈالا ہو یا ان میں سے کسی مقصود کا درجہ حاصل کرلیا ہو، چنانچہ کسی دین و مذہب کا یہ موضوع نہیں رہا کہ دنیا میں سہولت پیدا کرنے کے لئے آلات کس طرح بنائے جائیں گے؟ کسی دوسرے شہر یا ملک میں جانا ہو تو کس طرح جانا ہوگا؟ کونسی سواری پر کس طرح سوار ہونا ہے؟ اور نقل و حمل کے نت

---

[1] تحقیقات اسلامی علی گڑھ

نئے آلات کیونکر تیار کئے جائیں گے؟ جسمانی بیماری معلوم کرنے کا طریقہ کار کیا ہوگا؟ اور پھر جب مرض کا علم ہو جائے تو اس کے لئے کونسی دوائی استعمال کریں گے تاکہ بدن صحیح وسلامت رہے؟ گرمی و سردی سے بچنے اور پیٹ کی ہوس بھرنے کے لئے کس طرح چیزیں کس کس طرح پیدا ہوں گے؟ یہ اور اس نوعیت کی چیزیں سائنس و ٹیکنالوجی کا موضوع اور ایجاد وصناعت کا میدان کار ہے لیکن ان میں سے کوئی بھی چیز ایسی نہیں ہے جو دین ومذہب کا موضوع و مقصود ہو، لہٰذا اگر یہاں سائنس سو فیصد بلکہ اس سے بھی زیادہ ترقی کر لے تو اس کا مذہب سے کیا تعلق؟ اور اس "ترقی" کے بل بوتے پر مذہب سے بے زار اور لاتعلق ہونے کا کیا جواز رہ جاتا ہے؟

مثال کے طور پر دین ومذہب کا بڑا مقصود یہ ہوتا ہے کہ انسان کی اخروی زندگی سرخروئی اور کامیابی والی ہو اور دنیا کی زندگی میں بھی وہ بندے کی حیثیت سے رہے اور اس کے تمام تر مصروفیات اپنے خالق ومالک کی خوشنودی کے مطابق واقع ہوں۔ سائنس وٹیکنالوجی ہو یا عقل و تجربہ، ان سے یہ مقصود کیونکر پورا کیا جاسکتا ہے؟ ایجادات ومصنوعات کی سیل رواں نے اس مقصود کی تکمیل کے لئے کتنا راستہ طے کیا ہے جس کو بنیاد بنا کر ہم سائنس سے اپنی امیدیں باندھ لیں اور مذہبی تعلیمات سے ہم بالکل مستغنی ہو سکے؟ ظاہر ہے کہ یہ چیزیں سائنس وعقل کا موضوع کار ہے ہی نہیں اور نہ ہی یہ انسانی عقل کی جولان گاہ ہے جہاں وہ اپنے فکر وہنر کے جوہر دکھا سکے۔ اس لئے حقیقت یہ ہے کہ جب تک انسانیت رہے گی تب تک مذہب کی ضرورت واہمیت بھی برقرار رہے گی اور جن مقاصد کی تکمیل کے لئے انسان مذہب کا محتاج ہے، وہ اس کے علاوہ کسی دوسرے ماخذ سے حاصل ہونا ممکن ہی نہیں ہے۔

یہی اعتراض ایک دوسرے انداز میں بھی کیا جاتا ہے، وہ یہ ہے کہ دین ومذہب کی ضرورت تو تسلیم ہے لیکن دین اسلام کی تعلیمات واحکام صدیوں پرانی ہیں اور جس ماحول وعلاقہ میں یہ احکام نازل ہوئے تھے، وہ آج کل کے معاشرے کے لحاظ سے بالکل مختلف ہیں، دونوں معاشروں کے حال وماحول باہم حد درجہ متغایر ہیں، لہٰذا وہ احکام موجودہ دور کے انسان کی ضروریات کو پورا کرنے سے قاصر ہیں۔

جواب یہ ہے کہ اگر دین اسلام کا حق ہونا اور اس کے احکام وہدایات کا اللہ تعالٰی کی طرف سے نازل ہونا تسلیم کرلیا جائے تو اس کے بعد اس اعتراض میں کوئی وزن باقی نہیں رہ پاتا بلکہ ایک ہوائی بات ہی رہ جاتی ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ جب یہ احکام اللہ تعالٰی نے دئے ہیں اور وہی ان ہدایات کے نازل کرنے والے ہیں اور اس نے نازل بھی صرف ایک خاص قوم یا خاص وقت وصدی کے لئے نہیں ہے بلکہ دنیا بھر میں قیامت تک جتنے انسان ہوسکتے ہیں، ان سب کی طرف یہ احکام متوجہ ہوتے ہیں اور سب کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ ان احکام کے مطابق اپنی زندگی گزار لیں، تو اس کے بعد یہ خیال کرنا کہ "وہ احکام موجودہ دور کے انسان کی ضروریات پوری کرنے سے قاصر ہیں" ناقابلِ فہم ہے کیونکہ ایسا ورج ذیل وجوہات میں سے کسی ایک وجہ کی بناء پر ممکن ہے:

الف: علمی سطح پر کوئی نقص ہو۔ ماضی، حال یا مستقبل کی باتوں میں سے کوئی بات اس کے دائرہ علم سے باہر ہو، مثال کے طور پر انسان کے مزاج ومذاق سے اچھی طرح باخبر نہ ہو، یا مستقبل میں جو کچھ حالات د تبدیلیاں پیدا ہوں گی، ان سے ناواقف ہو۔

ب: عملی سطح پر کوئی کمزوری ہو۔ مثال کے طور پر جن لوگوں کو احکام دیئے ہو، ان سے شفقت و محبت نہ ہو، جاہ و مال جیسے جذبات کا حامل ہو، کسی دوسری طاقت سے مرعوب و مغلوب ہو اور اس کی وجہ سے درست رہنمائی نہ کرسکے، وغیرہ۔

قانون کی کمزوری یا زمانے کے چال کے ساتھ اس کی ناہمواری انہی دو وجوہات میں سے کسی عنصر کی بنیاد پر ہوتی ہے اور اگر یہ دونوں کمزوریاں بالکل موجود نہ ہو تو پھر کوئی وجہ نہیں ہے کہ ایسی ہستی کا دیا ہوا قانون کسی زمانے کی ضروریات کا ساتھ دینے کے قابل نہ ہو۔

اب جب یہ تسلیم ہے کہ دین اسلام اللہ تعالیٰ کا نازل کردہ ہے اور اسی ہستی نے یہ سارے احکام مشروع فرمائے ہیں تو پھر قوانین پر اشکال کرنے کی بنیاد یہی ہوسکتی ہے کہ (خدانخواستہ) اللہ تعالیٰ کو ان نئے پیش آمدہ حالات واحوال کا پہلے سے علم نہ تھا، یا علم تو تھا لیکن انسانیت کے ساتھ شفقت نہ ہونے، کسی دوسری طاقت کے خوف کے مارے یا ان جیسی کسی عنصر کی وجہ سے قانون میں کمزوری رہی۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ کے لئے ان جیسی کمزور باتوں کو منسوب کرنا اللہ تعالیٰ کو صحیح معنیٰ میں نہ ماننے کے مترادف ہے۔

اس سے دینِ اسلام اور دیگر قوانین و نظامہائے زندگی میں فرق بھی معلوم ہوجاتا ہے کہ ان نظاموں کے بنانے والے کہاں تک ان صفات سے متصف ہیں؟ کیا ان کا علمی و عملی کمال اللہ تعالیٰ کے صفات کے برابر یا اس سے زیادہ ہے؟ اگر نہیں اور یقیناً نہیں، تو پھر کیونکر ان چیزوں پر قناعت کی جاسکتی ہے اور کیوں اس کو خدا تعالیٰ کے بھیجے ہوئے نظام زندگی پر ترجیح دی جاسکتی ہے!

مولانا شمس الحق افغانی صاحب کی تحقیق

برصغیر پاک وہند کے ایک فلسفی مزاج اور علم وعمل کی حامل شخصیت علامہ شمس الحق افغانی صاحب رحمہ اللہ ہے۔ وہ ایک جگہ تحریر فرماتے ہیں:

"قانون ساز قوت میں مندرجہ ذیل امور کا پایا جانا ضروری ہے: ۱: علم تام۔ ۲: عدل کامل۔ ۳: رحمت وشفقت کاملہ۔ ۴: غیر جانبداری۔

یہ چار امور صرف اللہ کی ذات میں موجود ہیں، انسان خواہ فرد ہو جماعت، ان سے خالی ہے، لہٰذا انسان کو قانون اور ضابطہ حیات کی تشکیل کا حق نہیں۔" اس کے بعد آپ نے اس بات کا جائزہ لیا ہے کہ انسان میں کیونکر یہ چاروں صفات پورے طور پر موجود نہیں ہوتے۔[1]

دوسرا اعتراض: دین کی بعض باتیں خلاف عقل ہوتی ہیں

ہر دین کی بعض باتیں ایسی ہوتی ہیں جو خلاف عقل ہیں، دین ومذہب پر تبھی یقین واعتماد کیا جاسکتا ہے جبکہ عقل کی روشنی کو چھوڑ دیا جائے، اسی طرح ہر مذہب عقل کو پیچھے کرنے کی ترغیب کرتی ہے کہ بس میری ہی تعلیمات کو بالکل حق وسچ مان لو اور اگر عقل اس کے خلاف کہے تو اس کو جوتے کے نوک پر رکھ دو، حالانکہ عقل تو انسانی فضیلت وشرافت کی بنیاد ہے اور اس کے ساتھ ایسا رویہ برتنا انسان کو جانوروں کے ساتھ برابر کر دینے کی طرح ہے۔ اس باب میں دین اسلام اور دیگر ادیان کا کوئی فرق نہیں ہے بلکہ سب ادیان کے اندر یہ بات قدرِ مشترک کے طور پر معلوم ہوتی ہے۔

دین بے زار طبقات کی جانب سے یہ اشکال بڑے ہی زور وشور سے اٹھایا جاتا ہے اور بہت سے لوگوں کی گمراہی میں اس تصور کا بھی خاصا دخل اور شاید کلیدی کردار

---

[1] ملاحظہ فرمائیں: مقالات افغانی ج ۲ ص ۲۰۴۔

ہے، خاص کر مغرب کے دین بے زار طبقے کی جانب سے اس اشکال کو بار بار مختلف طریقوں سے اچھالا جاتا ہے۔

14 **جواب:**

اس قضیہ میں انصاف و دیانت داری کا تقاضا یہ ہے کہ ہم جب کسی چیز کے متعلق یہ کہتے ہیں کہ یہ خلاف عقل ہے اور خلاف عقل چیز سچی نہیں ہو سکتی۔ تو ان جیسے فیصلوں سے پہلے درج ذیل باتوں کی تنقیح کرنی ضروری ہے:

۱: عقل سے کیا مراد ہے؟

۲: عقل اگر کسی چیز کا ادراک کرتی ہے تو اس کے مآخذ کیا ہیں؟ اور ادراک کا دائرہ کار کیا ہے؟ کن کن چیزوں کا وہ وادراک کر سکتی ہے؟ کیا اس کے ادراک کا کوئی انتہاء بھی ہے جہاں جا کر وہ ادراک کرنے سے عاجز آئے یا ہر چیز کو اس پیمانے کے ذریعے معلوم کیا جا سکتا ہے؟

۳: عقل سے جو باتیں معلوم ہوتی ہیں، ان کا کیا حکم ہے؟ کیا وہ تمام معلومات سو فیصد یقینی ہوتی ہیں جن کی تردید ممکن نہ ہو اور اگر کوئی اس کے خلاف آجائے تو فوراً اس کو یہ کہہ کر رد کر دیا جائے کہ یہ خلاف یقین بات ہے؟

۴: جب ہم کسی چیز کو خلاف عقل کہتے ہیں تو اس کا معیار کیا ہے؟ کیا جو بھی چیز عقل میں نہ آئے اور وہاں تک عقل کی رسائی نہ ہو جائے، وہ خلاف عقل ہو گی یا اس کے لئے کوئی بھی ضابطہ ہے جس پر ہم کسی چیز کے خلاف عقل ہونے اور نہ ہونے کا فیصلہ کر سکتے ہیں؟

ان چار باتوں کا اگر اچھی طرح تصفیہ کیا جائے اور سب کا درست فیصلہ ہو جائے تو اس کے بعد دین حق کی اور خصوصاً دین اسلام کی کوئی بات خلاف عقل معلوم نہیں ہو گی۔ باب

اول میں اس کے متعلق کچھ ضروری تفصیل ذکر کی جاچکی ہے جس کو یہاں دہرانے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ اس کی طرف مراجعت کرنا مناسب ہے، البتہ اس اعتراض کی مناسبت سے اتنی بات ذکر کرنی کافی ہے کہ:

الف: کسی چیز کا سمجھ میں نہ آنا اور چیز ہے اور اس کا خلاف عقل ہونا اور چیز ہے، دونوں ایک نہیں ہے۔ دین ومذہب کی جن باتوں پر عقل کے خلاف ہونے کا دعویٰ کیا جاتا ہے، وہ در حقیقت اعتراض کرنے والوں کی سمجھ میں نہ آتی اور وہ اس کی حقیقت تک رسائی پانے سے قاصر رہتے ہیں اور اسی بنیاد پر اس کو خلاف عقل کہنا شروع کر دیتے ہیں۔

ب: جن چیزوں کو آج کل عقلی امور یا معقولات کہا جاتا ہے، ان میں سے بہت سی چیزیں ایسی ہیں جو نہ در حقیقت معقولی ہوتی ہے اور نہ ہی یقینی۔ چنانچہ ان میں سے بہت سی چیزیں حواس اور تجربہ واستقراء کے ذریعے بھی معلوم ہوئے ہوتے ہیں اور حواس کے ذریعہ یہ ادراک یا استقراء کے ذریعہ یہ استخراج بھی ایسا نہیں ہوتا جو علمی معیار کے اعتبار سے باعث یقین ہو بلکہ اکثر ناتمام تجربہ اور ناقص استقراء پر اس کی بنیاد رکھی جاتی ہے، اس لئے ہر عقلی کہلانے والی چیز کا یقینی ہونا ضروری نہیں ہے۔

کہا جاتا ہے کہ یہ عقلیت کا دور ہے جہاں ہر چیز کو عقل کی کسوٹی پر دیکھا اور پرکھا جاتا ہے، اور اُس ترازو میں تُلے بغیر کسی چیز کو سچ وحق تصور کرنا ایک قسم کی زبردستی اور تعصب کی بات ہے، یہ بات بظاہر دلربا اور ناقابل انکار ہے لیکن کاش کہ عقل اور عقلیت کے مفاہیم اور معاییر واضح کئے جاتے!

ج: دین ومذہب کا مصدر انسانی عقل نہیں ہے بلکہ اس کا مصدر آسمانی وحی ہے، لہٰذا ہر دینی بات کا عقل کے دائرہ کار کے اندر ہونا ضروری نہیں ہے اور جو باتیں اس

دائرے کے تحت آتی ہیں، ان کا بھی ہر شخص کے عقل میں آنا ضروری نہیں ہے بلکہ اس کے لئے "عقلِ سلیم" کی ضرورت ہے جس کا معیار باب اول میں تفصیل سے ذکر کیا گیا ہے۔ لہٰذا دین ومذہب کی ہر بات کو عقل پر تولنا، اور اگر وہاں تک عقل کی رسائی نہ ہو جائے تو نہ اس کی تردید کرنا جائز ہے اور نہ ہی ہر کس وناکس کی عقل کو معیار مقرر کرنا درست ہو سکتا ہے! اگر ہر چیز عقل میں آسکتی ہے اور عقل اس کی حقیقت جاننے تک رسائی کر سکتی ہے تو پھر تو وحی کی ضرورت باقی نہیں رہی! اور پھر کیوں کسی کو دین کا پابند بنایا جائے۔

ہر چیز کو عقل کے کسوٹی پر پرکھنا اور اسی کو کسی چیز کے حق یا باطل ہونے کا معیار بنانا در حقیقت وحی کی ضرورت واہمیت کے انکار کے مترادف یا اس کے قریب قریب ہے جس طرح کہ ہر دینی حکم میں دنیوی مصلحت کو تلاش کرنا اور اسی مصلحت کے موجود ہونے اور نہ ہونے پر دینی حکم کا قابل عمل ہونے نہ ہونے کا مدار رکھنا اس بات کا ہم معنیٰ معلوم ہوتا ہے کہ آخرت کوئی چیز نہیں ہے اور اس کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔

عقل سے متعلق حضرت مجدد صاحب کا ایک اہم مکتوب

حضرتؒ مجدد الف ثانی رحمہ اللہ ایک مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں:

" حساب، میزان (اعمال کا وزن) اور پل صراط "حق" ہے کہ مخبر صادق علیہ وعلی آلہ الصلاۃ والسلام نے ان کی خبر دی ہے۔ (لیکن) نبوت کے اطوار سے ناواقفیت کی بنا پر بعض جاہلوں کا ان امور کو بعید از عقل سمجھنا درجہ اعتبار سے ساقط ہے کیونکہ نبوت کے اطوار عقل کے اطوار سے بالاتر ہیں۔ حقیقت میں انبیاء کرامؑ کی سچی خبروں کو عقل کی نظر کے موافق کرنے کی کوشش کرنا حقیقت میں طورِ نبوت سے انکار ہے کیونکہ یہاں معاملہ صرف تقلیدِ انبیاء پر مبنی ہے، وہ یہ نہیں

جانتے کہ طورِ نبوت طورِ عقل کے خلاف ہے، بلکہ طورِ عقل انبیاء علیہم الصلوات والتسلیمات کی تقلید کی تائید کے بغیر اس عالی مطلب کی طرف ہدایت حاصل نہیں کر سکتی۔ مخالفت دوسری چیز ہے اور رسائی نہ ہونا دوسری بات ہے۔ کیونکہ مخالفت رسائی کے بعد متصور ہوتی ہے۔"[1]

تیسرا اعتراض: دین کی بعض احکام پر عمل کرنا مشکل ہے

دین کی بعض احکام پر عمل کرنا بڑا مشکل ہے، مثال کے طور پر دین اسلام کاروباری میدان میں سود، قمار اور دھوکہ دہی و غلط بیانی کی ممانعت کا حکم کرتا ہے حالانکہ موجودہ حالات میں معیشت و تجارت کی گاڑی ان کے بغیر چل نہیں پاتی اور اگر ان جیسے تمام دینی پابندیوں کو بروئے کار لایا جائے اور اسی کے مطابق کاروبار کو ضروری قرار دیا جائے جیسا کہ دین اسلام کا حکم ہے، تو معیشت و تجارت کا پہیہ جام ہو کر رہ جائے گا اور اس کا جو کچھ حشر ہوگا، اس کا تصور کرنا کوئی زیادہ مشکل نہیں ہے۔

جواب:

ہمیں اس بات سے کوئی انکار نہیں ہے کہ بحالت موجودہ دین کے بعض احکام پر عمل کرنا مشکل ہو رہا ہے لیکن محض اتنی سے بات سے مذہب کا غلط ہونا یا غیر ضروری ہونا معلوم نہیں ہوتا، بلکہ اس بات کا جائزہ لینا ضروری ہے کہ ان باتوں پر عمل کرنا کیوں مشکل ہے؟ اور کس حد تک مشکل ہے؟ قابل برداشت حد تک مشکل ہے یا ناقابل برداشت حد تک؟ اگر ان دو باتوں کا دیانت داری، سچائی اور سنجیدگی کے ساتھ جائزہ لیا جائے تو یقیناً اصل حقیقی بات کی طرف رسائی ہو جائے گی اور مذکورہ اشکال دفع جائے گا۔

---

[1] مکتوبات حضرت مجدد الف ثانی، مکتوب ۲۶۶، ج ۲، ص ۲۷۳

ان دینی احکام پر عمل مشکل ہونے کی بنیاد اگر یہ ہو کہ انسانی طاقت سے ماوراء احکام دئے گئے ہیں اور انسان کو ان امور کا بھی مکلف وذمہ دار ٹھہرایا گیا ہے جو اس کے دائرہ قدرت اور استطاعت سے یکسر باہر ہے تو ظاہر ہے کہ پھر یہ سوال متوجہ ہو سکتا تھا کہ جب کوئی کام انسان کی قدرت سے خارج ہے تو اس کو مکلف کیونکر قرار دیا جاتا ہے؟ اس میں کیا مصلحت ہے؟ لیکن دین اسلام کا کوئی حکم ایسا نہیں ہے اور خود قرآن کریم کا یہ دعویٰ ہے کہ:

﴿لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا﴾ [البقرة: ٢٨٦]

ترجمہ: "اللہ کسی کو اس کی طاقت کے سوا تکلیف نہیں دیتا"۔

لیکن اگر کسی حکم پر عمل کے مشکل ہونے کی وجہ یہ نہ ہو اور وہاں حکم میں کوئی ایسا عنصر موجود نہ ہو بلکہ محض خارجی عناصر کی وجہ سے مشکلات پیدا ہوتے ہوں تو اس صورت میں یہ اعتراض احکام دینیہ کے ذمے نہیں بلکہ ان عناصر کے ذمہ ہے جن کی وجہ سے ایسی مشکلات پیش آتی ہیں۔ اور حقیقت بھی یہی ہے کہ دین اسلام کے جن احکام کے بارے میں یہ تاثر دیا جاتا ہے کہ ان پر عمل کرنا مشکل ہے ان میں یہی حال ہے کہ وہاں حکم میں کوئی اشکال کی بات نہیں ہے اور بڑے عرصہ تک اس پر عمل ہوتا رہا ہے لیکن وہاں کوئی مشکلات پیدا نہیں ہوئے، تاہم اب ماحول اس کے خلاف ہو گیا اور بہت سی غلط باتیں بھی ماحول کا ایسا لازمی حصہ بن چکی ہیں جن کا غلط اور مضر ہونا محتاج بیان نہیں ہے، ہر عقل مند اور انصاف مزاج آدمی اس کی مضرت ونقصان سے واقف ہے، ایسی باتوں کے اسلامی معاشرے میں در آنے کی وجہ سے ان احکام پر عمل کرنے میں مشکل پیش آرہی ہے۔

تطبیقی مثال

مثال کے طور پر سود اور جھوٹ کی حرمت کا قضیہ ہے، بے شک دین اسلام نے ان کو حرام قرار دیا ہے، لیکن ان دونوں حکموں پر عمل کرنے میں مشکل کیا ہے؟ اگر طبیعت خوگرِ انصاف ہو تو ان کی خلاف ورزی کرنا مشکل محسوس ہوتا ہے، سود اور جھوٹ کی عقلی نقصانات کو اگر مستحضر رکھا جائے تو فطرت سلیمہ اس کو کرنے پر آسانی کے ساتھ آمادہ ہی نہیں ہوتی۔ اس لئے فی نفسہ ان احکام پر عمل کرنا کوئی مشکل نہیں ہے لیکن اب جب معاشرے میں بے دینی کی فضاء عام سے عام تر ہونے لگی اور لوگوں کے بہت سے معاملات اسی بے دینی کے اندھیر نگری کے نیچے آنے لگے اور طاعت ونیکی کی بنسبت معصیت ونافرمانی کا ماحول غالب ہوا، پھر اس پر ایک خاصا عرصہ بھی گزر گیا جس کی وجہ سے یہ چیزیں دل وجان میں راسخ بھی ہوتی رہی تو اس کے بعد تو ظاہر ہے کہ لوگ اپنے ماحول ومزاج کے مطابق معاملات انجام دیں گے اگرچہ وہ دینی احکام کے خلاف ہی ہوں اور جن لوگوں نے دین کے مطابق چلنے کا عزم وتہیہ کر رکھا ہوتا ہے، انہوں نے بھی اسی معاشرے کے انہی افراد سے واسطہ پڑتا ہے، یہیں سے بعض معاملات میں مشکلات پیدا ہو جاتے ہیں۔ لیکن اس سے ظاہر ہوا کہ خود دینی حکم میں کوئی مشکل نہیں تھا جس کی وجہ سے اس کو مذمت کا مستحق گردانا جائے بلکہ اگر قصور ہے تو معاشرے اور اس میں بسنے والے سب ہمت مسلمانوں کا ہے جو نافرمانی کے رواج پانے کا ذریعہ بن جاتے ہیں۔

چوتھا اعتراض: بعض باتوں میں سچائی نہیں ہوتی

دین ومذہب کے بہت سے وعدے سچے ثابت نہیں ہوتے، بہت سی باتوں کے بارے میں ذکر ہوتا ہے کہ جو شخص یہ کام کرے گا، اس کو فلاں فائدہ ملے گا یا فلاں

آفت سے اس کو نجات وحفاظت نصیب ہوگی، لیکن عملی طور پر ہم دیکھتے ہیں، ویسا ہوتا نہیں ہے جس طرح دینی تعلیمات میں ذکر کیا جاتا ہے، یہ اس بات کی نشاندہی ہے کہ تمام مذہبی تعلیمات سچائی پر مبنی نہیں ہیں اور جب بعض باتیں خلاف واقع ثابت ہو گئیں۔ اس طرح تو پورے مذہبی ڈھانچے پر سے اعتماد اٹھ جاتا ہے۔

جواب:

یہودیت ونصرانیت وغیرہ ادیان کے مرکزی کتابوں میں تحریف ثابت ہے، اس لئے اگر ان میں کوئی ایسا وعدہ یا خبر وغیرہ ذکر ہو جو واقع کے خلاف ثابت ہو تو بعید نہیں ہے لیکن اس کی وجہ سے اصل مذہب پر اشکال اس لئے وارد نہیں ہوتا کہ وہ وعدہ اور خبر در حقیقت اصل کتاب کا نہیں تھا، یوں ہی جعل سازی کے ساتھ اس کی طرف منسوب کیا گیا۔ دین اسلام کے مرکزی مصادر یعنی قرآن وحدیث میں اگر اس نوعیت کا کوئی نص ذکر ہوتا ہے تو وہ یقیناً خلافِ واقع نہیں ہوتا بلکہ سچ ہی ثابت ہوتا ہے۔

غلط فہمیوں کے اسباب

جن بعض امور کو پیش نظر رکھ کر اس طرح اشکال اٹھایا جاتا ہے کہ فلاں عمل کا یہ فائدہ بتایا گیا تھا لیکن اس کے باوجود کہ اس پر عمل کیا گیا اور اس پر وہ متوقعہ فائدہ مرتب نہیں ہوا؟ تو ایسا اشکال ضرور کسی نہ کسی غلط فہمیوں پر مبنی ہوتا ہے، یہاں ان غلط فہمیوں کے چند بڑے اسباب لکھے جاتے ہیں:

الف: نسبت کی غلطی۔ بہت سے ایسے دعویں ہیں جو قرآن وحدیث کی طرف منسوب کئے جاتے ہیں لیکن حقیقت میں وہ ثابت ہی نہیں ہوتے، خاص کر احادیث کے بارے میں ایسا بکثرت پیش آتا ہے کہ کسی بزرگ کا مقولہ دیکھا یا کوئی موضوع (من

گھڑت) وضعیف روایت نظر سے گزر گئی اور اس میں کوئی وعدہ یا خبر مذکور ہو جو بسا اوقات خلافِ واقع ثابت ہو جاتا ہے تو اس کو بنیاد بنا کر اشکال کیا جاتا ہے، حالانکہ ایسی باتوں کو جزم کے ساتھ شریعت کی طرف منسوب کرنا ہی قابل اشکال ہے۔

ب: بعض وعدے نصوص میں ذکر ہوتے ہیں لیکن وہ مطلق نہیں ہوتے کہ فلاں کام بہر حال ہو گا بلکہ کچھ شرائط و کوائف کے ساتھ بندھے ہوتے ہیں، اور وہ شرائط ہی وجود میں نہیں آتے تو اب ظاہر ہے کہ اگر مشروط چیز وجود میں نہ آئے تو یہ کوئی کذب بیانی یا دروغ گوئی نہیں ہے۔ اسی طرح بعض چیزیں نص میں ذکر تو ہوتی ہے لیکن ہر ایک کے حق میں نہیں ہوتی، بلکہ بعض اشخاص کے ساتھ مخصوص ہوتی ہیں یا کسی خاص زمان و مکان کے ساتھ مشروط ہوتی ہیں، اب اگر متعلقہ چیزوں کے موجود نہ ہونے کی وجہ سے وعدے کا تحقق نہ ہو جائے تو اس کو کذب و جھوٹ پر محمول کرنا کسی طرح درست نہیں ہو سکتا۔

نصوصِ فضائل سے متعلق ایک اہم علمی نکتہ

ج: بہت سی جگہ نصوص میں کسی عمل کا کوئی اثر اور نتیجہ ذکر کیا جاتا ہے، اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس عمل کی یہ خاصیت ہے اور اس کی فی نفسہ یہ تاثیر ہے، پھر عملی طور پر وہ کام کیا جاتا ہے لیکن ساتھ کوئی رکاوٹ بھی پائی جاتی ہے اور اسی رکاوٹ کی وجہ سے متعلقہ کام کا وہ نتیجہ ظاہر نہیں ہو جاتا جو نص میں بتایا گیا تھا۔ مثال کے طور پر روایات میں کلمہ طیبہ پڑھنے کی بڑی فضیلت بیان فرمائی گئی ہے اور بعض جگہ یہ بھی فرمایا گیا ہے کہ جو شخص اس کو پڑھتا ہے وہ جنت میں جائے گا۔ اب یہ فضیلت نصوص سے ثابت ہے لیکن اس کا یہ مفہوم نہیں ہے کہ کلمہ پڑھنے کے بعد جو جی میں آئے، کرتا رہے اور کوئی گناہ اس

کو جنت جانے سے روکنے کا ذریعہ ثابت نہیں ہو سکتی بلکہ مقصود یہی ہے کہ کلمہ کی یہ خاصیت ہے اور جب تک اس کے مقتضیات کے خلاف کوئی چیز وجود میں نہ آئے تب تک کلمہ کا یہ اثر ظاہر ہو گا۔ اب اس کے خلاف معاصی وغیرہ موجود ہوں گے تو اس صورت میں وہ فضیلت اس سے متعلقہ نص کے تحت داخل نہیں ہے لہٰذا یہ وعدہ بھی اس کے بارے میں نہیں ہے۔

ہندوستان کے مشہور عالم دین حضرت مولانا منظور نعمانی صاحب رحمہ اللہ اس مضمون کی ایک حدیث کی شرح کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

"اس قسم کی آیات اور احادیث پر غور کرتے وقت ایک اصولی بات یہ بھی ملحوظ رکھنے کے قابل ہے کہ اس قسم کی بشارتوں میں متکلم کا مقصد اور مطمح نظر کسی عمل خیر کی ذاتی خاصیت اور اس کا اصلی اثر بتلانا ہوتا ہے، قطع نظر اس سے کہ اگر دوسرے اعمال کا تقاضا اس کے خلاف ہو، تو پھر انجام کیا ہو گا اور یہ ایسا ہی ہے جیسے کہ طب کی کتابوں میں اسی اصول پر دواؤں کے خواص بیان کئے جاتے ہیں، مثلاً لکھا جاتا ہے، کہ جو شخص اطریفل استعمال کرتا رہے گا، وہ ہمیشہ نزلہ سے محفوظ رہے گا، اب اس سے یہ سمجھ لینا کہ جو شخص اطریفل کھانے کے ساتھ ساتھ تیل، ترشی وغیرہ (انتہائی درجے کی نزلہ پیدا کرنے والی) چیزیں بھی برابر کھاتا رہے، اس کو بھی کبھی نزلہ نہیں ہو گا، سخت نافہمی اور اطبا کے طرزِ کلام سے ناواقفی ہے۔

اس اصول کی روشنی میں اس قسم کی حدیثوں کا مدعا صرف اتنا ہی ہے کہ توحید و رسالت کی شہادت کا ذاتی اقتضاء یہی ہے کہ ایسا آدمی عذاب دوزخ سے محفوظ رہے، اور جنت میں جائے، لیکن اگر اس نے اپنی بدبختی سے کچھ ایسے بد اعمال بھی کئے ہیں جن کا ذاتی اقتضاء قرآن وحدیث میں عذاب پانا، اور دوزخ میں جانا ہی بتلایا گیا ہے، تو ظاہر ہے کہ وہ بھی اپنا کچھ نہ کچھ اثر ضرور ہی دکھائیں گے۔

اگر یہ چھوٹا سا نکتہ ملحوظ رکھا جائے، تو وعدہ و وعید اور ترغیب و ترہیب کے سلسلہ کی صدہا حدیثوں کے بارے میں لوگوں کو غلط فہمی اور اس کی وجہ سے جو الجھن پیدا ہوتی ہے، وہ ان شاء اللہ ختم ہو جائے گی۔"[1]

پانچواں اعتراض: دین دار مغلوب و ذلیل ہیں

دین دار لوگ ذلیل و مقہور ہوتے ہیں، چنانچہ معاصر دنیا اور اس میں بسنے والے انسانوں کا تجزیہ کیا جائے تو یہی نتیجہ ظاہر ہوتا ہے، اس لئے دین کوئی قابل تقلید یا لائق اتباع چیز نہیں ہے۔

جواب:

یہ کوئی عالمانہ اشکال نہیں ہے بلکہ ایک عامیانہ سی بات ہے، ان جیسی باتوں کی وجہ سے جو لوگ مذہب کے حوالہ سے تردد یا تردید کے نذر ہو جاتے ہیں، وہ اس بات کی قوت کی وجہ سے نہیں ہوتے بلکہ بیان کرنے والے کے زور بیان، ملمع سازی سے ایسا ہو جاتا ہے یا سننے والے کی ناسمجھی اور عقلی ناپختگی کا کرشمہ ہوتا ہے۔

تین بنیادی فیصلہ کن نکات

اس کی تفصیل یہ ہے کہ:

الف: پہلے تو ذلت و عزت کا مفہوم اور اس کا معیار و مدار متعین کرنا ضروری ہے کیونکہ ہر شخص اپنے نظریہ، مزاج اور ماحول و معاشرے کے مطابق اس کا الگ الگ مفہوم ذہن میں رکھتا ہے اور پھر اس کے اسباب و وسائل متعین کرتا ہے، عام طور پر مادی ترقی

---

[1] معارف الحدیث ج ا ص ۸۰.

وخوش حالی کو عزت اوراس کی متضاد صورت کو ذلت وپستی خیال کیاجاتا ہے حالانکہ شریعت کی نظر میں یہ عزت وذلت نہیں ہے اور عقل سلیم بھی اس کو عزت وذلت تسلیم نہیں کرتی۔

ب:اس کے بعد دوسرا تنقیحی مرحلہ یہ ہے کہ جس چیز کو ہم ذلت سمجھتے ہیں،وہ مسلمانوں کے اندر موجود بھی ہے یا نہیں؟

ج: اگلا اور آخری تنقیحی مرحلہ یہ ہے اگر واقعۃ مسلمانوں میں ذلت اور پستی پائی جاتی ہے تو اس کا بنیادی باعث کیا ہے؟ کیا خاص مسلمان ہونا اس کی علت ہے اور اسی اسلام اور مسلمانی کی بنیاد پر ان کو یہ ذلت دیکھنی پڑی؟ یا اس کے علاوہ کچھ اسباب وعناصر ہیں جو مسلمان قوم میں موجود ہے اوراس کی وجہ سے ان کو اس صورت حال کا سامنا کرنا پڑا؟

اس کا جواب یہی ہے کہ خود اسلام باعث ذلت بالکل نہیں ہے جس کی دو بنیادی وجوہات ہیں:

ا:جب کسی چیز کو دوسرے کے لئے علت یا باعث قرار دیاجاتا ہے تو دونوں چیزوں کا آپس میں مناسبت ضروری ہے، مناسبت کے بغیر ایک چیز کو دوسرے کے لئے علت قرار دینا بے جا اور خلافِ ضابطہ ہے جبکہ اسلام اور ذلت وپستی کے درمیان باہم کوئی مناسبت نہیں ہے۔ عزت وذلت کا مالک بھی خدا تعالیٰ ہے اوراس کے جزئیات وتفصیلات کو صحیح معنیٰ میں جاننے والا بھی وہی ذات ستودہ صفات ہے اور اسی ذات نے اسلام کو پسندیدہ ضابطۂ زندگی قرار دیا ہے تو اس میں ذلت کیونکر ہو سکتی ہے! یوں بھی دین اسلام کے تمام تر تعلیمات کو سامنے رکھ کر دیانت داری کے ساتھ اس کا جائزہ لیاجائے تو یہ واضح موجب عزت محسوس ہوتا ہے نہ کہ ذلت۔

مثال کے طور پر "حقوق العباد" سے متعلق دین اسلام نے سینکڑوں احکام وہدایات دئے ہیں، ان احکام پر جب کوئی عمل کرنے لگتا ہے تو اس کی وجہ سے دوسرے افراد کو راحت وسکون ملتی ہے، اس کو مختلف قسم کے مادی وروحانی فوائد مل جاتے ہیں اور معاشرے میں رہنے والے دیگر افراد ایسے شخص کے متعلق مطمئن ہوتے ہیں، وہ ایسے شخص کے متعلق ایسا کوئی خطرہ محسوس نہیں کرتے کہ وہ ان کی جان، مال یا عزت کو ٹھیس پہنچائے گا۔ ان جذبات ونفسیات کی وجہ سے معاشرے کے افراد میں ایسے شخص کی عزت بڑھے گی یا ذلت وپستی؟ ظاہر ہے کہ یہ عزت ہی کے اسباب ووسائل ہیں۔

۲: اگر اسلام ہی ذلت وپستی کا باعث ہے، تو اس کا اصولی تقاضا یہ تھا کہ جہاں اسلام موجود ہو وہاں ساتھ ذلت بھی موجود ہو، حالانکہ عملی طور پر مشاہدہ کیا جائے تو بات ایسی نہیں ہے بلکہ معاملہ اس کے برعکس اور بالکل برعکس ہے، چنانچہ جب مسلمان صحیح معنٰی میں مسلمان تھے اور دین اسلام کے تمام احکام پر عمل پیرا تھے تو وہ ایسے عزیز تھے جن کی عزت پر دوست ودشمن سب متفق تھے اور ہیں اور جب کبھی اعتقادی یا عملی بگاڑ پیدا ہونے لگا تو ساتھ ساتھ عزت وبلندی کی دیوار میں بھی دراڑے پڑنے شروع ہوئے۔ یوں تو مسلمانوں کی انفرادی اور اجتماعی دونوں سطح کی زندگیوں میں یہ بات تجزیہ کرکے دیکھی جاسکتی ہے لیکن اجتماعی زندگی میں یہ چیز بہت نمایاں محسوس ہوتی دکھائی دیتی ہے۔

اسلام اور مسلمانوں میں فرق

ان جیسے اشکالات کا بڑا باعث مسلمانوں کی موجودہ صورت حال ہے، مسلمان بحالت موجودہ جیسے کیسے ہیں وہ کسی ہوش مند اور فکر مند شخص سے مخفی نہیں ہے حالانکہ دیگر قومیں نام اور عنوان کے لحاظ سے ان سے کہیں فروتر ہے کہ وہ کافر وغیر مسلم کہلاتی

ہیں اور یہ لوگ مسلمان اور اللہ کے تابعدار گنوائے جاتے ہیں، عنوان کی اس برتری کے باوجود جب دیکھا جاتا ہے کہ مسلمان مقہور، ذلیل اور ہر جگہ مظلوم و مغلوب ہی ہیں جبکہ دیگر قومیں ان پر غالب و قاہر اور باعزت وبلند تر شمار ہوتے ہیں تو سوچتے سوچتے بات اسلام پر پہنچ جاتی ہے اور اسلام ہی کو ان ساری محرومیوں کا باعث تصور کیا جاتا ہے۔

حالانکہ اصولی لحاظ سے یہ بات بالکل غلط ہے۔ موٹی بات یہ ہے کہ اسلام اور مسلمان ایک چیز کے دو نام نہیں ہیں اگر چہ ہونا یہی چاہئے کہ ہر مسلمان نظریاتی اور عملی لحاظ سے اسلام کی سچی اور حقیقی تصویر ہو لیکن بحالت موجودہ ایسا ہے نہیں۔ بہت سے لوگ اعتقادی لحاظ سے تو ہوتے مسلمان ہیں لیکن ان کا کردار و گفتار اور اخلاق و معاملات اسلام سے ۱۸۰ از اویے پر ہوتے ہیں، اس لئے ان کی کمزوریوں اور کوتاہیوں کی ذمہ داری اسلام پر کسی طرح عائد نہیں ہوتی۔ جناب محمد قطب مرحوم ایک جگہ لکھتے ہیں:

"جس اسلام کی طرف ہم لوگوں کو بلاتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ وہ اس کو اپنی زندگیوں میں رہنما بنائیں، اس کا اس اسلام سے دور کا بھی واسطہ نہیں جس کو مشرق جدید کے یہ مسلمان حکمران اپنانے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ ان حکمرانوں کے دلوں میں قانون ربانی کے لئے کچھ بھی احترام اور لحاظ نہیں پایا جاتا، وہ جب چاہتے ہیں اس کے احکام اور فرامین کو پس پشت ڈال کر من مانی کرنے لگتے ہیں اور اس میں انہیں ذرہ بھر حجاب بھی محسوس نہیں ہوتا۔

اپنے معاملات زندگی میں انہیں اس سے روشنی اور ہدایت لینے کی کبھی ضرورت محسوس نہیں ہوتی، نہ ان کی وفاداریاں صرف اسی کے لئے خاص ہیں وہ جہاں اپنے حسب منشا کوئی چیز پاتے ہیں اس کو اختیار کر لیتے ہیں خواہ یہ یورپ کے کسی ملک کے انسانی قوانین ہو یا شریعت کے احکام اور جو چیز ان کی خواہشات اور مصلحتوں کے خلاف پڑتی ہے، اس کو اٹھا کر پرے پھینک دیتے ہیں۔ یہ لوگ نہ انسانوں کے وفادار ہیں، نہ خدا کے۔ وہ انسان اور خدا دونوں سے زیادتی اور

گستاخی کے مجرم ہیں، کیونکہ ان کا معیار ردّ و قبول، حق و صداقت نہیں ہے بلکہ ذاتی مصلحتیں اور حرص و ہوا ہے۔"[1]

چھٹا اعتراض: دین تفریق کا باعث ہے

دین و مذہب پر ایک عمومی اشکال یہ کیا جاتا ہے کہ اس کی وجہ سے معاشرے میں تفریق پیدا ہو جاتی ہے اور لوگ خواہ مخواہ مختلف ٹولوں اور طرح طرح کے گروہوں میں بٹنا شروع ہو جاتے ہیں جن کی وجہ سے معاشرے میں عداوتیں اور نفرتیں جنم لیتی ہیں اور صحیح انسانی بھائی چارگی بری طرح متاثر ہو جاتی ہے۔ بعض لوگ خاص دین اسلام پر بھی یہ اشکال داغ دیتے ہیں اور اس کو اسلام کا ایک غیر معمولی مذمتی عنصر گردانا جاتا ہے جس کا پلہ ہزار خوبیوں پر بھی بھاری ہی رہتا ہے، حالانکہ عیسائیت وغیرہ کے اندرونی فرقوں کا اگر جائزہ لیا جائے اور پھر اسلامی فرقوں کے ساتھ اس کا مقارنہ کر لیا جائے تو واضح ہو جاتا ہے کہ عیسائیت کے مقابلے میں اسلام سے وابستہ لوگوں میں فرقہ بندی کا مرض بہت کم ہے۔

جواب:

یہ چیز دین داری اور اسلام کے مقابلہ میں بے دینی اور بے زاری میں زیادہ پائی جاتی ہے، چنانچہ اس بات پر تمام عقل مندوں کا اتفاق ہے کہ اختلاف بذات خود مذموم و ممنوع نہیں ہوتا، بلکہ چونکہ اس کی وجہ سے انسان کی جان، مال یا عزتِ نفس مجروح ہو جاتی ہے اور آپس میں اتحاد و اتفاق اور محبت و شفقت، تعاون و تناصر کے جذبات کمزور

---

[1] اسلام اور جدید ذہن کے شبہات، ص ۳۔

ہونا شروع ہو جاتے ہیں، اس لئے یہ مذموم اور قابل نفرت کام ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ یہ خرابیاں دین کے نام پر ہونے والے تفرق میں زیادہ ہیں یا مادی وسیاسی بنیادوں پر استوار ہونے والے اختلافات وگروہ بندیوں میں؟

تفرق کی مختلف بنیادیں اور ان کے نتائج

مادی وسیاسی بنیادوں پر ایک تو جماعتیں بہت زیادہ بنتی ہیں کیونکہ ہر گروہ وقوم کے مفادات میں تصادم ہوتا ہے اور اسی بناء پر گروہوں پر گروہیں اور جماعتوں کی جماعتیں جنم لیتی ہیں اور پھر ایک جماعت کے افراد بھی چونکہ مادی فوائد کی بنیاد پر ہی کسی جتھے کے ساتھ شریک ہوتے ہیں، اس لئے اس ایک جتھے کے افراد کے دلوں میں ایک دوسرے کے لئے حقیقی پیار ومحبت کے جذبات کمیاب ہوتے ہیں جبکہ دینی ومذہبی بنیادوں پر ہونے والا تفرق ان دو باتوں میں ہلکا ہے، وہاں ایک تو جماعتیں زیادہ نہیں ہوتیں اور اگر فرقے وجود میں آ بھی جائیں تو بھی کم از کم ایک جماعت کے افراد میں ایک دوسرے کے لئے پیار ومحبت کے جذبات وتصورات ہوتے ہیں۔

پاکستان میں سیاسی پارٹیوں کی بہتات

گروہ بندی میں مذہب کا دخل زیادہ ہے یا غیر مذہبی رجحانات کا؟ اس بات کا کچھ ہلکا سا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ کچھ دنوں پہلے پاکستان الیکشن کمیشن کے رپورٹ کے مطابق وطن عزیز پاکستان میں رجسٹرڈ سیاسی پارٹیوں کی تعداد ایک سو ستر (۱۷۰) سے کچھ زیادہ ہے۔ ان پارٹیوں میں مذہبی جماعتوں کی تعداد چند ایک ہی ہے، باقی سب غیر مذہبی رجحانات کی پیداوار ہے، پھر مذہبی جماعتوں کی اس تعداد میں بھی غیر اسلامی نظام کا بڑا دخل اور اساسی کردار ہے۔

ب: دین ومذہب قومی وحدت کا ذریعہ ہے اور خود اس کا حکم بھی دیتا ہے چنانچہ دسیوں نصوص میں اتفاق واجتماع کا حکم دیا گیا ہے اور تفرق کی مذمت وممانعت فرمائی گئی ہے، اسی طرح بے صبری کے مختلف اسباب، مثال کے طور پر بے صبری، عیب جوئی وعیب گوئی، بدگمانی اور ظلم وتعدی وغیرہ کو دین ومذہب بنیاد سے کچل دیتا ہے لیکن بے دینی کے نتیجہ میں یہ چیزیں پائی جاتی ہیں۔

ج: بے دین ریاست اختلافات کو مٹا نہیں سکتی بلکہ اس کو قانونی شکل دیدیتی ہے جس سے اختلافات ختم نہیں ہوتے بلکہ قانونی روپ اختیار کر کے اس کی جڑیں مضبوط سے مضبوط تر ہو جاتی ہیں، مختلف عناصر کی وجہ سے آئے دن اس کی آبیاری ہوتی رہتی ہے اور اختلافات سے وابستہ بہت سے مفاسد ونقصانات پورے آب وتاب کے ساتھ برسر مجالس رقص عریاں کرتے ہیں۔ دینی ماحول میں تو یہ چیزیں اگر افراد کرتے بھی تھے تو ناجائز سمجھ کر اور مذموم ومعصیت خیال کر کے کرتے ہیں جس کی وجہ سے نفسیاتی طور پر ضمیر ساتھ نہیں دیتا اور اسی ناہمواری کی برکت سے ان جیسے اقدامات کا نقصان بھی زیادہ نہیں پھیلتا جبکہ بے دین ماحول اور قانون تو اس کو باقاعدہ قانونی شکل دے کر تحفظ فراہم کرتا ہے اور اب لوگ اس کو اپنا قانون یا انسانی حق سمجھ کر معاملہ شروع کرتے ہیں جن کی وجہ سے نقصانات کا دائرہ کار بڑھ جاتا ہے، ہاں اگر کوئی خوبی یا کمی ہے تو وہ یہ ہے کہ قانون کی گرفت سے بچنے کے لئے قتل وقتال کی نوبت نہیں آتی حالانکہ انسانیت اور پُرامن وپُرسکون ماحول کے لئے، جس طرح جنگ اور قتل وقتال موت ہے یوں ہی اختلافات کے دیگر مضر اثرات مثلاً بغض وعداوت، کردار کشی، عیب جوئی اور عیب گوئی بھی اس حوالہ سے برابر کردار ادا کرتے ہیں۔

نیز انصاف کی بات تو یہ ہے کہ سیکولر اور بے دین ماحول میں اختلافات کا دھارا بالکل بھی نہیں رکتا بلکہ مزید متحرک اور نتیجہ خیز ہو جاتا ہے۔ البتہ مذہبی معاشرے میں بعض دینی احکام و ہدایات سے روگردانی کے نتیجے میں اختلافات جنم لیتے تھے، ان اختلافات کے مقاصد، اہداف اور عنوانات بھی مذہبی ہوتیں ہیں اور سیکولر معاشرے میں مادی و دنیوی اسباب و اہداف کے خاطر پارٹیاں بنتی ہیں اور اس کے اہداف بھی مذہبی نہیں ہوتے بلکہ سیاسی و سماجی حقوق وغیرہ خوشنما القابات سے اس کو قائم رکھا جاتا ہے۔[1]

---

[1] عیسائیت کے ذیلی فرقوں کی تعداد:

یاد رہے کہ یہاں کسی خاص دین و مذہب کی بات نہیں ہو رہی بلکہ دین اور بے دینی کی روح اور اس کے اصل ضمیر کو سامنے رکھ کر گفتگو کی گئی ہے، لہٰذا یہاں دین کے تحت جس طرح دین اسلام داخل ہے یوں ہی اپنے اپنے اوقات میں یہودیت اور نصرانیت بھی برحق ادیان تھے، وہ بھی اس کے تحت شامل ہیں۔

لیکن بدقسمتی سے بعض اوقات یہ اعتراض خاص دین اسلام کے متعلق اٹھایا جاتا ہے اور اٹھایا جاتا بھی ان لوگوں کی جانب سے ہے جو ان دونوں ادیان میں سے کسی کی حامی بھرتے ہیں خاص کر نصرانیت سے وابستہ افراد اسلام اور امت مسلمہ کی بدنامی کے حوالہ سے جہاں اور کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے یوں ہی اس بات کو اسلام کے خلاف پروپیگنڈے کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے، حالانکہ تمام تر سیاسی، اخلاقی اور معاشی پہلوؤں سے اگر قطع نظر کرکے صرف اتنی زحمت گوارا کی جائے کہ موجودہ نصرانیت اور دین اسلام کی طرف منسوب فرقوں کی تعداد اور ان کی تفصیلات کیا ہیں؟ تو بھی بات صاف ہو جائے گی اور ان جیسے پروپیگنڈوں کی قلعی کھل جائے گی۔ امت مرحومہ کی کسمپرسی کے باوجود متعدد محققین کی تحقیق یہ ہے کہ نصرانیت کے فرقے اور جماعتیں اسلامی فرقوں اور جماعتوں سے کہیں زیادہ ہے، اس کا ایک اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ "حاضر الادیان" کے مصنف کے نزدیک "دین نصرانیت" میں اس وقت ۲۳۸۳۰ فرقے ہیں (ملاحظہ فرمائیں: حاضر الادیان" ص: ۵۰۷)۔

اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ یہ تو درج بالا اعتراض کی تصدیق و تائید ہو جاتی ہے اور واضح ہو جاتا ہے کہ واقعۃ دین کی وجہ سے معاشرے میں تفرق اور بگاڑ پیدا ہوتا ہے، کیونکہ دین کی تعلیمات میں اس بگاڑ و اختلاف کے اسباب موجود نہیں ہیں، بلکہ عقل و نقل شاہد ہیں کہ ایسا مرحلہ پیدا ہوتا ہی دین سے بغاوت کے نتیجے میں ہے۔

ساتواں اعتراض: دین کی پابندی تاخر اور پستی کا ذریعہ

دین کے بارے میں معاصر ذہن کا ایک اشکال یہ بھی ہے کہ اس سے تعلق نبھانا ترقی کی راہ میں رکاوٹ بنتا ہے، جس قدر اس سے رشتہ جوڑا جائے گا اور معاشرے کے ذہن و کردار پر اس کی گرفت مضبوط ہو گی، اسی قدر ترقی سے دوری پیدا ہو جائی گی۔ ہر زبان تو اس بات کی جسارت نہیں کر پاتی کہ یہ اشکال ظاہر کرے تاہم بہت سے لوگوں کے دل کی گہرائی میں یہ موجود ہوتا ہے۔

اشکال کا منشا اور منصفانہ تجزیہ

اس اشکال کا بنیادی باعث اور اصل محرک مغرب کی تاریخ اور اس کے مختلف ادوار دیکھنا ہے، چنانچہ جس دور میں اس کا اپنے "مذہب" سے تعلق قائم تھا، وہ جہالت و غربت کے سمندر میں محوِ تنزل تھے اور جوں ہی انہوں نے اس "ناسور" کو اپنے سے کاٹ کر الگ کر دیا اور اس کے محدود حصار سے نکلنا شروع کیا، تو دیکھتے ہی دیکھتے وہ سب کچھ ہوا جو دنیا دیکھتی ہے کہ جہاں رانی ان کے گلے کا ہار بن گیا اور پوری دنیا ان کے قدموں پر سجدہ ریز ہے۔

یہ اشکال بھی سطحی اور سرسری ہی ہے، اگر عقلی اور استخراجی منطق کے مفید سانچے میں اس کو ڈھال کر دیکھا جائے، تو صاف واضح ہو جاتا ہے کہ محض اتنی سی بات سے کوئی حتمی نتیجہ نکالنا زبردستی ہی ہے۔ چنانچہ اس موقف کو اپنانے سے پہلے یہ دیکھنا ضروری تھا کہ:

الف: مغرب کے ہاں "مذہب" کے نام سے جو چیز رائج تھی وہ واقعۃ کوئی آسمانی دین تھا یا اس خوشنما نام اور معصوم و دلربا عنوان پر کسی اور چیز کی حکمرانی تھی؟

ب: کیاان کی زندگی میں یہی ایک چیز تھی جو ان کو آگے بڑھنے سے روک رہی تھی یا کچھ اور عناصر بھی تھے؟

ج: اسی طرح جس چیز کو ہم ترقی سے تعبیر کرنا چاہتے ہیں، کیا وہ واقعۃً ترقی ہے بھی یا نہیں؟

ترقی سے روکنے کی دو صورتیں

انصاف اور عقل کی بات یہ ہے کہ کسی بھی نظریہ، فلسفے یا دین ومذہب کے ترقی سے روکنے کی دو صورتیں ممکن ہیں:

الف: صراحت کے ساتھ ترقی کرنے سے روک دے اور لوگوں کو صاف طور پر ترقی سے منع کرے۔

ب: صراحت کے ساتھ تو منع نہ کرے لیکن سب یا کچھ تعلیمات ایسی ہوں جو اپنے پیروکار کے ذمے ضروری قرار دیے جائیں لیکن ترقی کے ساتھ ان کو جمع کرنا ممکن نہ ہو، باہمی تضاد و تصادم کا یہ حال ہو کہ یا تو ان ضروری تعلیمات پر عمل کرنے کی نوبت آئے گی اور یا ترقی کی راہ پر گامزن ہونے کی توفیق وسعادت نصیب ہو سکتی ہو۔

اب دینِ اسلام کا کونسا حکم ایسا ہے جو اس معیار کے مطابق اپنے پیروکاروں کو ترقی کرنے سے روکے رکھے؟ اگر دین اسلام اور اس کے تمام تر تعلیمات وہدایات کو اس عقلی سانچے پر پرکھ کر دیکھ لیا جائے تو حقیقت واضح ہو جاتی ہے اور معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ دین تو اپنے ماننے والوں میں جوشِ عمل کی آبیاری کرتا رہتا ہے، ان کو فضول کاموں اور لایعنی امور میں لگنے سے نکال باہر کرتا ہے اور مفید کاموں میں آگے بڑھنے کی حوصلہ افزائی کرتا ہے، پھر اس کو ترقی سے روکنے کا الزام دینا کیونکر درست ہو سکتا ہے! اور دیکھا جائے تو

واقعاتی دنیا بھی اس کی کھلی تکذیب کرتی ہے چنانچہ "اسلامی اندلس" کے زمانے میں دین کی حکمرانی بھی تھی اور جس چیز کو آج ترقی کا نام دیا جاتا ہے، اس کے طرح طرح دروازے بھی چوپٹ کھلے تھے۔ یہ بات اگر مغربی انسان کرے جس نے کلیسا کی اجارہ داری کا زمانہ دیکھا سنا ہو تو شاید کوئی زیادہ مضائقہ نہ ہو لیکن دین حق کے متعلق ایسی بات کرنا بالکل بے جا اور قطعاً بے محل ہے۔

آٹھواں اشکال: مذہب اختیاری چیز ہے

دین ومذہب کے حوالہ سے معاصر ذہن کی ایک غلط فہمی یہ بھی ہے کہ مذہب ایک اختیاری چیز ہے، کوئی چاہے تو اختیار کرے اور اچھی بات ہے لیکن کوئی نہ چاہے تو وہ قابلِ ملامت نہیں ہے۔ اختیار کرنے کی صورت میں بھی وہ جس مذہب کو چاہے، اختیار کر سکتا ہے، کسی خاص مذہب کی پابندی ضروری نہیں ہے۔ اس کو اشکال یا اعتراض کا مقام دینا تو شاید زیبا نہ دکھائی دے لیکن بہر حال ایک غلط فہمی ہے جو شعوری یا لاشعوری طور پر بہت سے دل و دماغوں میں موجود ہوتی ہے۔

انصاف اور دانش مندی کا تقاضا یہ ہے کہ اس میں خود دین ومذہب کی تعلیمات کی طرف مراجعت کی جائے اور وہی سے اس کا جواب حاصل کر لیا جائے کہ وہ واقعۃً یہی تعلیم دیتا ہے یا نہیں؟ دنیا میں شاید کوئی بھی مذہب ایسا نہیں ہو گا جو اس طرح اپنے آپ کے اختیاری ہونے کا درس دیتا ہو کہ کوئی چاہے تو مجھے قبول کرے اور کوئی چاہے تو چھوڑ دے۔ آسمانی مذاہب تو در کنار، جمہوریت واشتراکیت وغیرہ مصنوعی فلسفوں کے ذمہ داران افراد بھی اپنے نظریات کو ہر جگہ ٹھونس دینے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں اور جہاں بس چلتا ہے وہاں اپنی پسندیدہ نظریات گاڑنا شروع کر دیتے ہیں۔

دین اسلام کا موقف

اس حوالہ سے دین اسلام کی تعلیم بھی یہی ہے کہ یہ پوری انسانیت کے لئے پیغام ہدایت اور ضابطہ حیات ہے، جس کو اس کی دعوت پہنچے، اس کی ذمہ داری ہے کہ اس کو گلے لگائے اور اپنی زندگی کے لمحات کو اس کی رہنمائی میں طے کرتا رہے، جو شخص اس دین حق کی دعوت پہنچنے کے باوجود بھی اس کو ٹکرائے گا اور بے دینی کی زندگی گزارے گا یا کسی اور دین ومذہب کی پیروی کرے گا، وہ اخروی لحاظ سے بالکل نجات دہندہ نہیں ہو سکتا۔ قرآن کریم میں ہے:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا ادْخُلُوا فِي السِّلْمِ كَافَّةً وَلَا تَتَّبِعُوا خُطُوَاتِ الشَّيْطَانِ إِنَّهُ لَكُمْ عَدُوٌّ مُبِينٌ (۲۰۸) فَإِنْ زَلَلْتُمْ مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَتْكُمُ الْبَيِّنَاتُ فَاعْلَمُوا أَنَّ اللهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ﴾[۱]

ترجمہ: "اے ایمان والو اسلام میں سارے کے سارے داخل ہو جاؤ اور شیطان کے قدموں کی پیروی نہ کرو کیونکہ وہ تمہارا صریح دشمن ہے، پھر اگر تم کھلی کھلی نشانیاں آجانے کے بعد بھی پھسل گئے تو جان لو کہ اللہ غالب حکمت والا ہے"۔

ایک دوسری جگہ فرمان خداوندی ہے:

﴿وَمَنْ يَبْتَغِ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِينًا فَلَنْ يُقْبَلَ مِنْهُ وَهُوَ فِي الْآخِرَةِ مِنَ الْخَاسِرِينَ﴾[۲]

ترجمہ: "اور جو کوئی اسلام کے سوا اور کوئی دین چاہے تو وہ اس سے ہر گز قبول نہیں کیا جائے گا اور وہ آخرت میں نقصان اٹھانے والوں میں سے ہو گا"۔

اس آیت میں کسی خاص دین ومذہب کی مذمت یا ممانعت کا بیان نہیں کیا گیا بلکہ "غیر اسلام" کی مذمت بیان کی گئی جس میں دیگر ادیان ومذاہب بھی داخل ہو جاتے ہیں اور دین بے زاری اور دہریت کی نامبارک صورتیں بھی۔ "صحیح بخاری" کی روایت ہے:

عن ابن عمر، أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: «أمرت أن أقاتل الناس حتى يشهدوا أن لا إله إلا الله، وأن محمدا رسول الله، ويقيموا الصلاة، ويؤتوا الزكاة، فإذا فعلوا ذلك عصموا مني دماءهم وأموالهم إلا بحق الإسلام، وحسابهم على الله»[1].

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہے کہ رسول ﷺ نے فرمایا: مجھے لوگ کے ساتھ اس وقت تک جہاد کرنے کا حکم کیا گیا ہے جب تک وہ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور محمد ﷺ کو اللہ کے رسول ہونے کی گواہی نہ دے، اور یہاں تک کہ نماز قائم کرے، اور زکوٰۃ ادا کرے، پس جب یہ لوگ یہ کام کرے تو ان کے جان اور اموال ہم سے محفوظ ہو جائیں گے، مگر اسلام کے حکم کی وجہ سے ہم ان کے جان اور اموال لے سکتے ہیں، اور ان کا حساب اللہ کے ذمے ہیں"۔

اس روایت میں صراحت ہے کہ اسلام کا پیغام ہدایت پوری انسانیت کے لئے عام ہے اور سبھی لوگ اس کو قبول کرنے کے مکلف ہیں۔

---

[1] صحيح البخاري، باب: {فإن تابوا وأقاموا الصلاة وآتوا الزكاة فخلوا سبيلهم} ج ۱ ص ۱۴.

زبردستی نہیں بلکہ عین خیر خواہی

یہ خواہ مخواہ کی زبردستی نہیں ہے بلکہ اعلیٰ درجہ کی خیر خواہی اور شفقت کا تقاضا یہ ہے ،چنانچہ دین اسلام جب انسان کے حق میں سراسر خیر خواہی، بھلائی اور خیر ہی خیر ہے جس پر اس کی دنیوی اور اخروی زندگی کا درست و متوازن ہونا موقوف ہے تو کیوں نہ اس کو اس پر مجبور نہ کیا جائے! یہ مجبور کرنا ایسا ہی ہے جس طرح ناسمجھ بچے کو کڑوی دوا استعمال کرنے پر مجبور کیا جاتا ہے، جس طرح مریض اور ناسمجھ بچے کو اختیار نہیں دیا جاتا بلکہ مجبور ہی کیا جاتا ہے اور یہ مجبور کرنا خالص خیر خواہی اور رحمت و شفقت کا موجب تصور کیا جاتا ہے یوں ہی حضرت انسان چونکہ روحانی دنیا اور عالم آخرت کے حقائق سے یکسر غافل اور بالکل ناواقف ہے، وہ اپنی مرضی سے ان چیزوں کو سمجھ سکتا ہے نہ ہی وہاں اپنے لئے کوئی متوازن مقام پیدا کر سکتا ہے، اس لئے اس کو مجبور کرنا ضروری ہے اور اختیار دینا رحمت و شفقت کے تقاضا کے سراسر خلاف ہے۔

ایک بے جا استدلال

اس سلسلے میں بسا اوقات آیت کریمہ "لا اکراہ فی الدین" اور اس کے ہم معنیٰ نصوص سے بھی استدلال کیا جاتا ہے جو بالکل ہی بے محل ہے، اس آیت کا یہ معنیٰ قطعاً نہیں ہے کہ انسان کو اختیار ہے کہ چاہے تو اسلام قبول کرے اور چاہے تو نہ کرے، یہ مفہوم تو قرآن و حدیث کے سینکڑوں نصوص سے متصادم ہے۔ بلکہ آیت کریمہ کا حاصل اتنا ہے کہ مسلمانوں کو یہ اختیار نہیں ہے کہ کسی کافر کو خاص دین اسلام کے قبول کرنے پر مجبور کردیں بلکہ دین حق قبول کرنے کی دعوت دینا اور اس کے لئے سازگار ماحول فراہم کردینا کافی ہے، دوسرے الفاظ میں یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ اس آیت کا تعلق مسلمانوں کے ساتھ

ہے کہ وہ کسی کو بزور بازو قبول اسلام پر مجبور نہ کریں، دیگر افراد کے ساتھ اس کا تعلق نہیں ہے کہ وہ چاہیں تو دائرہ اسلام کے تحت داخل ہو جائیں اور چاہیں تو دور ہی دور رہیں۔

نواں اشکال: کیا دین اسلام قتل وفساد کا داعی ہے؟

بعض معاشروں میں اسلام کے خلاف پورے تسلسل اور بڑے تواتر کے ساتھ پروپیگنڈہ کیا جاتا رہا جس کے نتیجے میں وہاں کے لوگوں کے ذہن میں اس دین کے خلاف یہ خیال بھی جنم لیتا رہا کہ یہ دین باہم قتل وغارتگری، خون خواری اور فساد کا علمبردار ہے، اس دین پر چلنے کے نتیجے میں انسانی معاشرہ جنگ وجدال کی تصویر بن کررہ جائے گا؛ اس سلسلے میں وہ حضور نبی اکرم ﷺ کے غزوات کو بھی پیش کرتے ہیں، صحابہ کرام کے جنگی معرکوں کو بھی استدلال میں پیش کرتے ہیں۔ شروع شروع میں تو اس کی حیثیت ایک خیال وخدشہ ہی کی تھی لیکن پروپیگنڈے کے زور وقوت اور تسلسل نے اس کو مستقل اور مضبوط نظریہ کی شکل دیدی جس کے بعد اس کو اسلام کے خلاف اعتراضات واشکالات میں سے نمایاں تر اشکال واعتراض کی حیثیت حاصل ہو گئی۔

جواب:

اس اعتراض کا دلیل وبرہان یا عقل واستدلال سے کوئی تعلق نہیں ہے، ہم پوری ذمہ داری سے سے کہنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ اسلام کی تعلیم وتاریخ کو غلط طور پیش کرنے اور اس طرح کرتے رہنے سے ہی یہ اور اس قسم کے دیگر اشکالات نے جنم لیا ہے۔ اس اشکال کی حقیقتِ حال تک پہنچنے کے لئے درج ذیل دو باتوں کا حقیقت پسندانہ جائزہ لینا ضروری ہے:

الف:فساد وخوانخواری کی حقیقت کیاہے؟ کیا ہر قسم کی لڑائی وجنگ فساد کہلاتا ہے یااس میں اچھے برے کی تقسیم بھی ہوسکتی ہے؟

ب:اسلامی تعلیمات کا اصل سرچشمہ قرآن وحدیث ہی ہیں،ان کی ہدایات کا جائزہ لیکر اس بات کا تجزیہ کیاجائے کہ وہ لوگوں کے ساتھ کس طرح تعامل برتنے کی تعلیم وتلقین کرتی ہے اوروہ اپنے پیرؤں کو اس حوالہ سے کیاحکم دیتی ہے؟

نظام جنگ معلوم کرنے کے تین اہم زاویے

حقیقت یہ ہے کہ دنیا کاکوئی فلسفہ ونظام بھی ایسانہیں ہے جو اپنے دامن میں کمال وجامعیت کا دعوی کرتی ہے،انسانی معاشرے کی قیادت وسیادت سنبھالنے کا عندیہ دیتی ہو اور اس میں جنگ کا تصور نہ ہو۔اس وقت کونسی حکومت ایسی ہے جو جنگی فوج نہیں رکھتی!اگر ہر طرح کی لڑائی مذموم ہی ہے تو پھر اس طرح انتظامات کرنے کی کیاضرورت رہ جاتی ہے!

اصل بات یہ ہے کہ لڑائی وجنگ ہر کامل نظام اور مکمل فلسفے کا حصہ ہوتاہے، البتہ جنگ کب،کیوں اور کس طرح لڑی جائے؟یہ تین اہم حل طلب سوالات ہیں جس کے حقیقی جوابات کے بعد ہی کسی نظام / دین کا اصل نظریہ معلوم کیاجاسکتاہے اوراس کے بعد اس کے متعلق کچھ تبصرہ کرنے کی گنجائش پیداہوسکتی ہے۔

اسلام کا نظریہ جنگ

معاصر دنیا کے تمام نظاموں اور فلسفوں میں جب ان تین بنیادی سوالات کا جواب طلب کیا جاتا ہے تو تعصب کے بغیر واضح ہو جاتا ہے کہ اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جو اپنے دامن میں نہایت مناسب اور معتدل "نظام جنگ" رکھتا ہے، چنانچہ:

الف: وہ مجبوری کے بغیر جنگ وجدال کا قائل نہیں ہے بلکہ سختی کے ساتھ اس کی تردید ومذمت کرتا ہے، اجتماع ومعاشرے کے ساتھ جنگ تو در کنار وہ تو کسی ذمی کافر کے قتل کرنے کو بھی مسلمان کے قتل کرنے کے برابر سمجھتی ہے بلکہ بعض پہلوؤں کے لحاظ سے اس کی زیادہ مذمت کرتی ہے۔ البتہ اس کی نظر میں مجبوری کا وہ تصور بالکل نہیں ہے جو معاصر نظامہائے معیشت کا تصور ہے کہ اپنے مادی مفاد کی خاطر دوسروں کو جنگ میں دھکیل دیا جائے بلکہ اس حوالے سے بھی اسلام کا نظریہ جنگ بہت ہی معتدل ومناسب ہے۔

ب: وہ ذاتی مفاد کی خاطر جنگ کرنے کی تعلیم نہیں دیتا، کہ اپنے مفاد کو بروئے کار لانے کے لئے دوسروں پر جنگ مسلط کی جائے بلکہ اس کا سبق تو یہی ہے کہ جب تک کوئی شخص اپنے حدود میں رہے، اس سے مسلح تعرض بالکل نہ کی جائے، جب کوئی قوم ومعاشرہ حدود سے نکل جاتا ہے تو بھی فوراً جنگ مسلط کرنے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ دیگر مناسب ذرائع سے اصلاح احوال کی کوشش ہونی چاہئے اور جب دیگر راستے کسی طرح کارگر ثابت نہ ہو تو پھر جنگ کا حکم ہے۔

ج: دین اسلام جن صورتوں میں مسلمانوں کو جنگ کرنے کی اجازت دیتا ہے، وہاں بھی مغربی طاقتوں کی طرح اپنے لڑنے والوں میں جنونی کیفیت پیدا کر کے

ہر کسی کو قتل کرنے کی اجازت نہیں ہے بلکہ اس کے لئے بھی حدود وضوابط مقرر ہیں جس کی پابندی حالت جنگ اور میدان جنگ میں بھی ضروری ہے، اسی طرح ہر طرح قتل کرنے کی بھی اجازت نہیں ہے بلکہ اس کے لئے ایک ضابطہ مقرر ہے جس سے بلا وجہ عدول کرنے کی اجازت نہیں ہے۔

دین بے زاری کی جنگیں! دعوتِ انصاف

یہ تو اشکال وجواب کی حد تک بات ہے۔ ورنہ حقیقت حال یہ ہے کہ دین بے زار نظام زندگی میں جس قدر فساد وخونخواری ہوتی ہے، جس قدر قتل وغارتگری اس کے نتیجے میں معاشرے کو ملتی ہے، وہ مقدار وکیفیت ہر لحاظ سے بہت ہی زیادہ اور وحشت ناک ہے۔ امریکہ وروس نے ایک صدی میں جتنے مظالم کئے، جس قدر لوگوں کو تہ تیغ کیا یا ان کے جان، مال اور عزت کو نقصان پہنچایا، اس کا اگر ان نقصانات کے ساتھ موازنہ کیا جائے جو دین اسلام کی تعلیمات کے مطابق چودہ صدیوں پر محیط جنگوں کے نتیجے میں پیش آئے تو واضح فرق محسوس ہوگا اور صاف ظاہر ہوگا کہ امریکہ وروس کے صرف ایک صدی کے مظالم ان نقصانات کے مقابلہ میں زیادہ اور بہت ہی زیادہ ہے۔ ہٹلر وغیرہ جنگ جو لوگوں کو آخر کس اسلام نے یہ تعلیم دی تھی کہ وہ لوگوں کا قتل عام کرتے پھریں! اور اگر اسلام ہی فساد وخون خواری کا داعی ہے تو ان جیسے بیسیوں غیر مسلم قائدین پوری زندگی کیوں فساد وخون خواری کا بازار گرم کرتے رہیں!

دسواں اشکال: دین اسلام کے عصری اثرات ونتائج

قرآن وحدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ دین اسلام کے متعدد فوائد وبرکات ہیں، مسلمان علماء کی طرف سے بھی اس قسم کے دعوے کئے جاتے ہیں، لیکن عملی طور پر عالم اسلام کی جو صورت حال ہے، وہ کسی سے پوشیدہ نہیں ہے کہ مسلمان قوم بیشتر جگہوں میں مغلوبیت، ذلت اور کسمپرسی ہی کے شکار ہیں۔ عالمی مردم شماری میں گو عیسائی مذہب کے ماننے والے اکثر دکھائے جاتے ہیں لیکن بظاہر مسلمان ہی سب سے زیادہ ہیں، تمام مذاہب کی بنسبت اسی مذہب کی دلدادہ غالب ہیں لیکن اس کے باوجود حقیقت واقعہ یہ ہے کہ مسلمان جہاں اقلیت میں ہے، وہاں وہ ذلت ومظلومیت کے شکار ہیں اور جہاں کہیں اکثریت میں ہیں، وہاں دھوکہ وفریب، کرپشن وناانصافی کا غلغلہ ہے۔ اس سے اسلام کے اس دعویٰ پر دھبہ پڑتا ہے کہ وہ اپنے ماننے والے کے لئے دنیا میں بھی ابرِ رحمت کی حیثیت رکھتا ہے۔

جواب:

اس اشکال میں یہ بات تو درست ہے کہ دینِ اسلام کے اس دعوی پر دھبہ پڑتا ہے کہ وہ اپنے ماننے والے کے لئے دنیا میں بھی ابرِ رحمت کی حیثیت رکھتا ہے اور مسلمان قوم کی جس طرح اخروی کامیابی اسلام کے بغیر متصور نہیں ہے، یوں ہی دنیوی فوز وفلاح بھی اسی دین اسلام کی پابندی کے ساتھ ہی جڑی ہوئی ہے، قرآن وسنت کے متعدد نصوص میں یہ مضمون مختلف طریقوں سے بیان ہوا ہے۔ مثال کے طور پر ارشادِ خداوندی ہے:

﴿وَلَوْ أَنَّ أَهْلَ الْقُرَىٰ آمَنُوا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِم بَرَكَاتٍ مِّنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ﴾ [الأعراف: ٩٦]

ترجمہ: "اور اگر بستیوں والے ایمان لے آتے اور ڈرتے تو ہم ان پر آسمان اور زمین سے نعمتوں کے دروازے کھول دیتے"۔

یہ بات بھی بڑی حد تک درست اور واقع کے مطابق ہے کہ مسلمان قوم اس وقت مجموعی حیثیت سے اچھی حالت میں نہیں ہے، ان کی اجتماعی زندگی اور اس کا اجتماعی اثر کچھ زیادہ قابلِ تقلید نہیں ہے، لیکن اس سے اسلام کی تعلیمات یا اس کے کئے ہوئے وعدوں اور پیشن گوئیوں پر کوئی دھبہ نہیں پڑتا۔

اسلام کے باوجود ناکامی کی اساس

اس کی صاف سیدھی وجہ یہ ہے کہ اسلام صرف کلمہ کہنے، نماز پڑھنے یا اس قسم کے چند ایک کام کرنے کا نام نہیں ہے بلکہ پورا نظام زندگی اور مکمل ضابطہ حیات کا نام ہے، قرآن وسنت میں کہیں ایسا دعوی نہیں کیا گیا کہ جو شخص / قوم صرف کلمہ توحید کہے وہ دنیا میں خوش وخرم زندگی گزاریں گے یا لوگوں کی قیادت کریں گے وغیرہ۔ بلکہ جہاں بھی ایسی بات کی گئی ہے، وہاں صراحت کے ساتھ یا اشاروں میں یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ متعلقہ افراد / قوم دین اسلام کی تعلیمات پر عمل بھی کریں۔ چنانچہ درج بالا آیت مبارکہ ہی کو دیکھ لیا جائے، وہاں صرف ایمان کے ساتھ دنیوی برکات نصیب ہونے کی بات نہیں کی گئی بلکہ ساتھ "تقوی" کا بھی ذکر کیا گیا ہے اور "ایمان وتقوی" کے مجموعے کے ساتھ ہی آسمان وزمین کی برکات کھولنے کی خبر دی گئی ہے۔ اس تناظر میں مسلمان قوم کا جائزہ

لیا جائے تو گہرے افسوس کے ساتھ یہی کہنا پڑتا ہے کہ انہوں نے ابھی تک اس شرط کو پورا نہیں کیا، لہٰذا نتیجہ حاصل کرنے کے بھی وہ مستحق نہیں ہیں۔

اس کے برعکس ماضی کے دریچوں میں دیکھا جائے تو حضرات صحابہ کرام اور ان کے بعد کے مسلمان جب اس شرط پر پورا پورا اتر گئے، دین اسلام کی تعلیمات وہدایات کو اپنے اندر جگہ دیدی تو زمین وآسمان شاہد ہیں کہ ان کی زندگی بڑی قابل رشک بن گئی، حالانکہ اس زمانے میں اگر دیگر قوموں کے ساتھ ان کا تقابل کیا جائے تو ظاہری مادی لحاظ سے مسلمان کم تر تھے، دین اسلام کی نعمت اور اس کے اثرات وبرکات کے علاوہ اور کوئی بنیادی امتیازی خوبی نہیں تھی جو ان کے حریف قوم میں موجود نہ ہو۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

فصل دوم:

دین اسلام کے حقوق اور اس میں رائج کوتاہیوں کی نشاندہی

یہاں یہ بات جاننا بھی فائدے سے خالی نہیں ہے کہ ایک انسان اور بالخصوص مسلمان پر دین اسلام کے کیا کچھ حقوق عائد ہوتے ہیں؟ دین حق کی جانب سے انسان پر کیا ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں؟ اس حوالہ سے خود دین اسلام کا کیا موقف ہے؟

یوں تو قرآن وحدیث کا وسیع ذخیرہ ان جیسے نصوص سے بھرا ہے جن میں مختلف طریقوں سے دین اسلام کے حقوق کی تعلیم دی گئی ہے اور متنوع اسالیب کے ساتھ انسانی ضمیر کو جھنجوڑا گیا ہے، لیکن ذیل میں اختصار کے ساتھ چند نصوص ترجمہ کے ساتھ ذکر کئے جاتے ہیں اور ان کی روشنی میں جو حقوق سامنے آتے ہیں، ان کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔

سورہ مائدہ میں ہے:

﴿لْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَأَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي وَرَضِيتُ لَكُمُ الْإِسْلَامَ دِينًا﴾ [المائدة: ۳]

ترجمہ: "آج میں تمہارے لیے تمہارا دین پورا کر چکا اور میں نے تم پر اپنا احسان پورا کر دیا اور میں نے تمہارے واسطے اسلام ہی کو دین پسند کیا ہے"۔

سورۃ یونس میں ارشاد خداوندی ہے:

﴿ قُلْ بِفَضْلِ اللهِ وَبِرَحْمَتِهِ فَبِذَٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوا هُوَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُونَ ﴾ [یونس: ۵۸]

ترجمہ: "کہہ دو (قرآن) اللہ کے فضل اور اس کی رحمت سے ہے سو اسی پر انھیں خوش ہونا چاہیئے یہ ان چیزوں سے بہتر ہے جو جمع کرتے ہیں"۔

سورۃ احزاب میں ہے:

﴿وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَلَا مُؤْمِنَةٍ إِذَا قَضَى اللهُ وَرَسُولُهُ أَمْرًا أَنْ يَكُونَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ أَمْرِهِمْ وَمَنْ يَعْصِ اللهَ وَرَسُولَهُ فَقَدْ ضَلَّ ضَلَالًا مُبِينًا﴾ [الأحزاب: ٣٦]

ترجمہ: "اور کسی مومن مرد اور مومن عورت کو لائق نہیں کہ جب اللہ اور اس کا رسول کسی کام کا حکم دے تو انھیں اپنے کام میں اختیار باقی رہے اور جس نے اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کی تو وہ صریح گمراہ ہوا"۔

ایک اور جگہ فرمان خداوندی ہے:

﴿فَأَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّينِ حَنِيفًا فِطْرَتَ اللهِ الَّتِي فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا لَا تَبْدِيلَ لِخَلْقِ اللهِ ذَلِكَ الدِّينُ الْقَيِّمُ وَلَكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ﴾ [الروم: ٣٠]

ترجمہ: "سو تو ایک طرف کا ہو کر دین پر سیدھا منہ کیے چلا جا اللہ کی دی ہوئی قابلیت پر جس پر اس نے لوگوں کو پیدا کیا ہے اللہ کی بناوٹ میں ردوبدل نہیں یہی سیدھا دین ہے لیکن اکثر آدمی نہیں جانتے"۔

سورۃ حجرات میں ہے:

﴿قَالَتِ الْأَعْرَابُ آمَنَّا قُلْ لَمْ تُؤْمِنُوا وَلَكِنْ قُولُوا أَسْلَمْنَا وَلَمَّا يَدْخُلِ الْإِيمَانُ فِي قُلُوبِكُمْ وَإِنْ تُطِيعُوا اللهَ وَرَسُولَهُ لَا يَلِتْكُمْ مِنْ أَعْمَالِكُمْ شَيْئًا إِنَّ اللهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ

الَّذِينَ آمَنُوا بِاللهِ وَرَسُولِهِ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوا وَجَاهَدُوا بِأَمْوَالِهِمْ
وَأَنْفُسِهِمْ فِي سَبِيلِ اللهِ أُولَئِكَ هُمُ الصَّادِقُونَ قُلْ
أَتُعَلِّمُونَ اللهَ بِدِينِكُمْ وَاللهُ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي
الْأَرْضِ وَاللهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ يَمُنُّونَ عَلَيْكَ أَنْ أَسْلَمُوا
قُلْ لَا تَمُنُّوا عَلَيَّ إِسْلَامَكُمْ بَلِ اللهُ يَمُنُّ عَلَيْكُمْ أَنْ هَدَاكُمْ
لِلْإِيمَانِ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ﴾ [الحجرات: ١٤ - ١٧]

ترجمہ: "بدویوں نے کہا ہم ایمان لے آئے ہیں کہہ دو تم ایمان نہیں لائے لیکن تم کہو کہ ہم مسلمان ہو گئے ہیں اور ابھی تک ایمان تمہارے دلوں میں داخل نہیں ہوا اور اگر تم اللہ اور اس کے رسول کا حکم مانو تو تمہارے اعمال میں سے کچھ بھی کم نہیں کرے گا بیشک اللہ بخشنے والا نہایت رحم والا ہے۔ بیشک سچے مسلمان تو وہی ہیں جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائے پھر انہوں نے شک نہ کیا اور اپنے مالوں اور اپنی جانوں سے اللہ کی راہ میں جہاد کیا وہی سچے (مسلمان) ہیں۔ کہہ دو کیا تم اللہ کو اپنی دین داری جتاتے ہو اور اللہ جانتا ہے جو کچھ آسمانوں میں اور زمین میں ہے اور اللہ ہر چیز کو جاننے والا ہے۔ آپ پر اپنے اسلام لانے کا احسان جتاتے ہیں کہہ دو مجھ پر اپنے اسلام لانے کا احسان نہ جتلاؤ بلکہ اللہ تم پر احسان رکھتا ہے کہ اس نے ایمان کی طرف تمہاری رہنمائی کی اگر تم سچے ہو"۔

دین اسلام کے نو(۹)ضروری حقوق

ان نصوص کی روشنی میں دین اسلام کے جو حقوق ثابت ہوتے ہیں، ان میں سے چند نمایاں یہ ہیں:

۱: دین اسلام کو نعمت خداوندی سمجھنا۔ نعمت کے مفہوم کا حاصل یہ ہے کہ کسی کو بلا عوض فائدہ پہنچایا جائے، اوراس معنیٰ میں دین اسلام اور اس کی تمام تر تعلیمات کا نعمت ہونا ایسا واضح ہے جس کے بیان کرنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی، چنانچہ اس میں دنیا وآخرت کے فوز وفلاح کے طریقوں کی کامل تعلیم دی گئی ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ دونوں جہانوں کی پوری کامیابی اس دین متین کی پوری تابعداری پر موقوف ہے، یہ خود دین اسلام کا دعویٰ ہے اور معقول بھی ہے چنانچہ "دین کی ضرورت واہمیت" کی بحث میں اس کی کچھ تفصیل ذکر ہو چکی ہے۔

۲: دین اسلام کو کامل ومکمل یقین کرنا۔ انسان کے انفرادی اور اجتماعی زندگی کے ہر موڑ اور ہر ہر قدم سے متعلق دین اسلام نے کچھ ہدایات دیئے ہیں، کسی بھی شعبہ اور کسی بھی مرحلہ پر انسان کو بے کار نہیں چھوڑا بلکہ قدم قدم پر اس کی پوری پوری رہنمائی فرمائی ہے، لہٰذا ایک تو اس بات کا یقین کرنا ضروری ہے اور ساتھ یہ بھی عقیدہ رکھنا لازم ہے کہ اس کی تعلیمات میں کسی قسم کا کوئی نقص، علمی یا عملی سقم وکمزوری نہیں ہے جس کو پورا کرنے کے لئے کسی اور جگہ سے سہارا لینے کی ضرورت پڑے۔

۳: پوری دلجمعی اور قلبی اطمینان کے ساتھ اس کی حقانیت کا اعتقاد رکھنا اور عملی طور پر اس کی پابندی کرنا۔ اس کو بوجھ، تکلیف یا مشقت کا ذریعہ خیال نہ کیا جائے بلکہ دل وجان سے اس کو اپنی خیر خواہی، شدید ضرورت اور نہایت اہمیت کا حامل یقین کیا جائے، چنانچہ

جس طرح ضرورت کے مطابق کھانا پینا وغیرہ بوجھ نہیں ہے بلکہ انسانی بدن کے بقاء کا ذریعہ ہے، یوں ہی دین اسلام کی تعلیمات وہدایات کو اپنے اوپر بوجھ کا باعث تصور نہ کیا جائے بلکہ اپنی کامیاب زندگی اور شاندار آخرت کو اس پر موقوف خیال کرنا ضروری ہے۔

۴: اس پر خوشی اور فرحت بھی کی جائے، اور دنیا جہاں کی تمام نعمتوں سے اس کو عزیز تر سمجھا جائے چنانچہ "سورہ یونس" کی درج بالا آیت سے واضح ہوتا ہے۔ جب دین اسلام اور اس کی تعلیمات کا نعمت خداوندی ہونا واضح ہو گیا، تو اس کے بعد اس کا یہ حق بھی بدیہی بن جاتا ہے کہ دلی خوشی کے ساتھ اس کے ہر ہر حکم کا خیر مقدم کیا جائے، چنانچہ سخی شخص کے اصرار کے باوجود اس کے احسان کو ٹھکرانا نہایت مذموم تصور کیا جاتا ہے اور ناراضگی کی کیفیت کے ساتھ وصول کرنا بھی ایسا ہی قابل مذمت سمجھا جاتا ہے۔

۵: دین اسلام کو خود مقصود سمجھ کر اپنی پوری زندگی اس کے سانچے میں ڈالنا۔ دین اسلام کو ذاتی خواہشات، مادی مفاد وغیرہ چیزوں کے حاصل کرنے کا ذریعہ خیال نہ کیا جائے۔ بہت سے لوگوں کی دین بے زاری کی اصل وجوہات کا اگر کھوج لگایا جائے تو واضح ہوتا ہے کہ انہوں نے دین اسلام اور اس کے احکام وہدایات پر عمل کرنے کو اصل مقصودِ زندگی نہیں بنایا بلکہ اس کو حالات کی درستگی، مالداری وتونگری، عزت وشہرت وغیرہ اغراض ومفادات حاصل کرنے کا ایک شکنجہ خیال کیا اور پھر جب " دین داری " کے باوجود ان کے اہداف ومقاصد حاصل نہ ہوئے تو انہوں نے دین بے زاری کی راہ اختیار کیں۔

یہ انسانیت کا پرانا مرض ہے، قرآن کریم میں بھی اس کا شکوہ فرمایا گیا ہے، چنانچہ ارشادِ خداوندی ہے:

﴿ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَعْبُدُ اللهَ عَلَىٰ حَرْفٍ فَإِنْ أَصَابَهُ خَيْرٌ اطْمَأَنَّ بِهِ وَإِنْ أَصَابَتْهُ فِتْنَةٌ انْقَلَبَ عَلَىٰ وَجْهِهِ خَسِرَ الدُّنْيَا وَالْآخِرَةَ ذَٰلِكَ هُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِينُ ﴾ [الحج: ۱۱]

ترجمہ: "اور بعض وہ لوگ ہیں کہ اللہ کی بندگی کنارے پر ہو کر کرتے ہیں پھر اگر اسے کچھ فائدہ پہنچ گیا تو اس عبادت پر قائم ہو گیا اور اگر تکلیف پہنچ گئی تو منہ کے بل پھر گیا دنیا اور آخرت گنوائی یہی وہ صریح خسارا ہے"۔

۶: دین اسلام کے کسی حکم کے واضح ہو جانے کے بعد اس میں کسی طرح پس وپیش، تامل یا توقف نہ کیا جائے۔ نہ عقل و تجربہ کی تصدیق و تائید کرنے پر اس کو موقوف رکھا جائے، نہ لوگوں کے موافق یا مخالف ہونے کا اس میں اعتبار کیا جائے۔ دین اسلام کے تمام تر احکام و تعلیمات کو زندہ کرنے کی بھرپور کوشش کی جائے، اس کو زندگی اور متاع زندگی کا مقصود اور اصل مطمح نظر بنایا جائے اور اس باب میں اپنی ممکنہ توانیاں خرچ کی جائیں۔

۷: ایمان کے دعویٰ میں سچائی کا یہ بھی تقاضا ہے کہ دل کی گہرائیوں میں اس کی عظمت واہمیت اس قدر راسخ و مستحکم ہو جائے جس کے بعد اپنے جان ومال کو اس پر نثار کیا جاسکے، دین اسلام کے کسی حکم کے ساتھ اگر جان، مال، معاشرتی جاہ وجلال وغیرہ کسی چیز کا تصادم ہو جائے تو دینی حکم کی بجاآوری کو ہر چیز پر مقدم رکھے اور اپنے کسی بھی مفاد کے لئے حکم کی قربانی نہ دی جائے بلکہ تمام تر اغراض ومفادات کو اس پر نچھاور کیا جائے۔

۸: دینی تعلیمات پر عمل درآمد کرنے اور اس سلسلہ میں جان ومال وغیرہ کی قربانی دینے کو اپنا کمال یا دین اسلام کے ساتھ احسان نہ سمجھا جائے بلکہ خدا کے اس دین کو اس

سے کہیں زیادہ قربانیوں کا مستحق سمجھا جائے اور اس طرح قربانی کرنے کا جو کچھ موقع ملتا رہے، خود اس کو اللہ تعالیٰ کا فضل واحسان ہی یقین کیا جائے کہ اسی کی توفیق ومشیت سے مجھے یہ سعادت ملی ہے کہ اس کے حکم کی خاطر اپنے متاعِ دنیوی کو قربان کر رہا ہوں۔

۹:جب یقینی ہے کہ دینِ اسلام غیر معمولی نعمتِ خداوندی ہے، دنیا اور آخرت کے فوز وفلاح کی واحد کلید ہے تو جس طرح دیگر نعمتوں کو بے فائدہ ضیاع وہلاکت سے بچانا ضروری ہے، یوں ہی اس نعمت عظمیٰ کو بھی بچائے رکھنا لازم ہے، ہر آندھی طوفان سے اس کی حفاظت کرتے رہنا ضروری ہے۔ جس علاقہ / ماحول / مجلس وغیرہ میں خطرہ ہو کہ دینی جذبات واحساسات کو گزند پہنچ جائے گی، وہاں سے دور رہنا نہایت ضروری ہے۔ اس کی اصل قرآن کریم کی یہ آیت کریمہ ہے:

﴿وَقَدْ نَزَّلَ عَلَيْكُمْ فِي الْكِتَابِ أَنْ إِذَا سَمِعْتُمْ آيَاتِ اللّٰهِ يُكْفَرُ بِهَا وَيُسْتَهْزَأُ بِهَا فَلَا تَقْعُدُوا مَعَهُمْ حَتّٰى يَخُوضُوا فِي حَدِيثٍ غَيْرِهِ إِنَّكُمْ إِذًا مِثْلُهُمْ إِنَّ اللّٰهَ جَامِعُ الْمُنَافِقِينَ وَالْكَافِرِينَ فِي جَهَنَّمَ جَمِيعًا﴾ [النساء: ١٤٠]

ترجمہ: "اور اللہ نے تم پر قرآن میں حکم اتارا ہے کہ جب تم اللہ کی آیتوں پر انکار اور مذاق ہوتا سنو تو ان کے ساتھ نہ بیٹھو یہاں تک کہ کسی بات میں مشغول ہوں ورنہ تم بھی ان جیسے ہو جاؤ گے اور اللہ منافقوں اور کافروں کو دوزخ میں ایک ہی جگہ اکھٹا کرنے والا ہے"۔

دین کے ساتھ مسلمانوں کی ناجائز برتاؤ کی نو(۹) صورتیں

یہ تو وہ امور ہیں جو دینِ اسلام کے حقوق اور اس کی طرف سے عائد ہونے والی ذمہ داریاں ہیں ۔اور خود دین اسلام اپنے پیروکاروں سے اس کو بجالانے کا تقاضا کرتا ہے۔اس کے ساتھ ساتھ ایک نظر اس جانب بھی پھیرنا ضروری ہے کہ دینِ اسلام کے حوالہ سے ہمارا انفرادی اور اجتماعی برتاؤ کیا ہے؟ درج بالا حقوق کے حوالہ سے ہمارا عام معاشرتی رویہ کیا اور کیسا ہے؟ عام طور پر انسانی معاشرے اور خود مسلمانوں کا اپنے دین اسلام کے ساتھ جو کچھ ربط و تعلق ہے،اس میں متعدد کوتاہیاں پائی جاتی ہیں جن میں سے چند نمایاں غلطیاں درج ذیل ہیں:

۱: دین اسلام کے حقانیت کا یقین نہ رکھنا۔چنانچہ کبھی تمام مذاہب کا انکار کیا جاتا ہے اور بسا اوقات خاص دین اسلام کے ساتھ ایسا رویہ برتا جاتا ہے۔

یاد رہے کہ "یقین نہ رکھنا" اس بات کو بھی شامل ہے کہ صاف گوئی کے ساتھ دین اسلام کے حق اور لائق عمل ہونے کا انکار کیا جائے اور یہ بھی اس کی ایک صورت ہے کہ کوئی صاف انکار تو نہ کرے لیکن اس کے بارے میں وہ دل ہی دل میں کشمکش کا شکار ہو۔ اسی طرح یہ بات بھی ذہن میں اجاگر کرنے کی ضرورت ہے کہ دین اسلام کے انکار کرنے یا اس کے متعلق تردد و تذبذب کی ایک شکل تو یہی ہے کہ پورے ہی دینی ڈھانچے کا انکار کیا جائے یا اس کے بارے میں تردد کی کیفیت سے دوچار ہو جایا جائے اور یہ بھی اس کی ایک صورت ہے کہ دینِ اسلام کے دیے ہوئے احکام میں سے کسی حکم کے ساتھ اس طرح انکار یا تذبذب کا رویہ برتا جائے۔

۲: حقانیت جیسا برتاؤ نہ کرنا۔ چنانچہ بہت سے لوگ اس کو زبانی طور پر تو حق سمجھتے ہیں لیکن ان کی عملی زندگی اس بات کی تصدیق نہیں کرتی اور وہ دینی تعلیمات واحکام کی پوری طرح پابندی نہیں کرتے۔

۳: دینی تعلیمات کے مطابق اعتقاد نہ رکھنا۔ جس کی بیسیوں صورتوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ دین اسلام کے ساتھ ساتھ کچھ اور ادیان ومذاہب کو بھی نجات کا باعث اور حق کا حامل تصور کیا جائے۔

۴: دین ومذہب کی قیادت ورہنمائی کو صرف نظریات وعقائد، اخلاقیات، عبادات یا انفرادی زندگی وغیرہ کسی میدان ومرحلہ کے ساتھ مخصوص ومحدود سمجھنا، انسانی زندگی کے کسی سطح کو دینی ہدایات کے دائرے سے باہر خیال کرنا۔

۵: اسلام اور اس کی تعلیمات پر عمل کرنے کو ناممکن یا باعث نقصان سمجھنا، اس کو مسلمان امت کے انحطاط وپستی کا موجب یقین کرنا۔

۶: انسانی زندگی کے کسی میدان میں متعلقہ دینی احکام کو پس پشت ڈالنا اور اس کی طرف بالکل التفات نہ کرنا۔

۷: دین اسلام اور اس کی کچھ یا تمام تعلیمات کو اصل مقصود کا درجہ نہ دینا بلکہ ثانوی درجے میں رکھنا۔

۸: دین اسلام اور اس کی کچھ تعلیمات پر پختہ اور غیر متزلزل یقین نہ رکھنا، بلکہ اس سلسلے میں تردد وتذبذب کا شکار ہونا۔ قرآن وسنت کے نصوص میں مختلف اعمال کے جو کچھ وعدے یا فضائل مذکور ہیں، ان کے متعلق بے اعتمادی کی کیفیت سے دوچار رہنا۔

۹: دین اسلام کو باعثِ فضلیت چیز خیال نہ کرنا، اسی کا نتیجہ ہے کہ مسلمان اور غیر مسلم کو برابر باور کیا جاتا ہے اور انسانیت ہی کو معراج ترقی تصور کرایا جاتا ہے، ملکی وملی اجتماعی امور میں مسلمان اور غیر مسلم کا فرق مٹایا جاتا ہے بلکہ اس کو تعصب، تنگ نظری اور انتہاء پسندی وغیرہ قابل نفرت عنوانات والقابات سے مشہور کیا جاتا ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

خاتمہ

اس مختصر سے کتابچہ میں درج ذیل موضوعات پر گفتگو کی گئی ہے:

۱: پہلے باب میں دین ومذہب کا تعارف کیا گیا ہے، انسانی زندگی میں اس کی ضرورت اور غیر معمولی اہمیت کو اجاگر کیا گیا ہے، دین ومذہب کے حوالہ سے معاشرے کے خیالات وتصورات پر تفصیلی بات کی گئی ہے، دین میں خلل وفساد اور تحریف کیوں پیدا ہوتا ہے؟ اس کے اسباب واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے، اور اس طے شدہ حقیقت کو اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ انسانی زندگی کے مختلف گوشے ایسے ہیں جن کی تکمیل کا واحد ذریعہ دین ومذہب کی تعلیمات پر عمل پیرا ہونا ہی ہے۔

۲: دوسرے باب میں دین اسلام اور اس کے مختلف شعبوں کا جامع اور مختصر تعارف کیا گیا ہے، اس کے چیدہ چیدہ تعلیمات کو ذکر کیا گیا ہے، دین اسلام کی معنویت اور اس کی خصوصیات پر تفصیلی بات کی گئی ہے اور اس حقیقت کو دہرایا گیا ہے کہ اس وقت سطح زمین پر جس قدر ادیان ومذاہب کا چرچا کیا جاتا ہے، ان سب میں ایک واحد دین اسلام ہی ہے جو اپنی اصل آسمان سے نازل شدہ شکل میں موجود ہے اور عقل ونقل ہر لحاظ سے یہی وہ دین ہے جس کو گلے لگائے بغیر نجات حاصل کرنا ممکن نہیں ہے۔

۳: تیسرے باب میں دین داری اور بے دینی کے لحاظ سے موجودہ مسلم معاشرے کا جائزہ لیا گیا ہے، عقائد، عبادات، معاملات، معاشرت اور اخلاقیات سے متعلق امت کی موجودہ روش کا تجزیہ کیا گیا ہے اور یہ افسوسناک حقیقت واضح کی گئی

ہے کہ اس وقت امت مسلمہ ان تمام شعبہ جات میں بے دینی اور دین بے زاری کے انتہاء پر ہے اور ان میں کوئی شعبہ ایسا نہیں ہے جہاں دینی تعلیمات روئے زمین پر اپنے تمام تقاضوں کے ساتھ جلوہ گر ہوں۔ اسی باب کی دوسری فصل میں ان نقصانات کا ذکر کیا گیا ہے جو دینی تعلیمات پر عمل چھوڑنے کی وجہ سے معاشرے کو اٹھانے پڑے؟

۴: موجودہ بے دینی اور دین بے زاری کے اسباب وعناصر کیا ہیں؟ وہ کونسی ایسی وجوہات ہیں جن کی وجہ سے مسلمان اپنے اسلام اور اس کے سنہرے احکام وہدایات سے اس قدر غافل ہیں؟ ان اسباب ووجوہات سے نمٹنے کا طریقہ کار کیا ہے؟ چوتھے باب میں ان باتوں پر تفصیلی گفتگو کی گئی ہے اور اس حوالہ سے مختلف مفکرین کے آراء وتجربات ذکر کئے گئے ہیں۔

۵: دین، مذہب اور اسلام کے حوالہ سے مغربی یلغار اور تسلط کی وجہ سے جو غلط فہمیاں پیدا ہوئی ہے یا ان کو پھیلایا گیا ہے اور پھر ان غلط فہمیوں کی بنیاد پر موجودہ دور کے انسان کے ذہن میں دین کے حوالہ سے جو اشکالات واعتراضات پیدا ہوتے ہیں، ان کا منصفانہ جائزہ لیا گیا ہے، پورے انصاف اور سنجیدگی کے ساتھ ان کا تجزیہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اسی باب کی دوسری فصل میں دین اسلام کے حقوق اور اس حوالہ سے امت مسلمہ کی ذمہ داریوں کو واضح کیا گیا ہے، نیز دین اسلام کے ساتھ امت مسلمہ کے موجودہ برتاؤ میں رائج کمزوریوں کو نکھارنے کی کوشش کی گئی ہے۔

سفارشات وگزارشات

۱: یہ کتابچہ جس موضوع سے متعلق ہے، وہ عصر حاضر کے اہم موضوعات میں سے سر فہرست ہے، یہ موضوع اس بات کا متقاضی ہے کہ امت کے ہی خواہ اپنی استطاعت کی حد تک اس کی طرف پوری توجہ فرمائیں، تاہم یہ بات بھی مسلم ہے کہ صرف کتاب لکھنا کسی مسئلے کا پورا حل نہیں ہے جب تک اس کی بنیاد پر کام کو استقلال کے ساتھ آگے نہ چلایا جائے۔ اس لئے علمی اور عملی ہر سطح پر اس کی طرف فوری توجہ کی ضرورت ہے۔

۲: بے دینی اور دین بے زاری کے بہت سے اسباب ایسے ہیں جو ہمارے دائرہ اختیار کے اندر ہیں، ہم اگر چاہے تو ہم میں سے ہر شخص انفرادی طور پر بھی اپنی ذات اور اپنے حلقہ اثر کی حد تک ان کا سد باب کر سکتا ہے، ان جیسے اسباب کو بروئے کار لانے میں اور پھر اس پر ثابت قدم رہنے میں کسی قسم کی کوئی کوتاہی، غفلت، تاخیر یا تعطیل کا ہر گز شکار نہیں ہونا چاہئے بلکہ فوری بنیادوں پر اس کا اہتمام کر لیا جائے اور اپنی حد تک کسی قسم کمزوری کو بالکل برداشت نہ کیا جائے۔

۳: اجتماعی نوعیت کے اسباب اور ایسے عناصر جو پوری طرح ہمارے اختیار میں نہیں ہیں، ان کو مکمل طور پر معطل رکھنے کی بجائے یہی مناسب ہے کہ اپنے اپنے حصے کی حد تک آدمی کام کرتا رہے اور ساتھ ساتھ اگر ہو سکے تو دوسرے افراد کو بھی اس کی متوجہ کرنے کی کوشش کرتا رہے۔

۴: نوجوان نسل کے لئے اس طرح علمی، فکری اور اصلاحی نشستوں کا اہتمام کیا جائے، ان مجالس میں اخلاص، سادگی اور متانت وسنجیدگی کا دامن مضبوطی سے پکڑتے

رہنا چاہئے اور ساتھ نوجوان نسل کی ترجیحات ومذاق کا بھی جائز حد تک لحاظ رکھا جانا چاہئے۔

۵: اس بات میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ کسی قوم کے نظریات وافکار اور مزاج ومذاق میں وہاں کے نظام تعلیم کا بھی بہت کچھ کردار ہوتا ہے، نظام تعلیم کی اگر اچھی طرح اصلاح کی جائے تو بلاشبہ بے دینی کے لاکھوں مظاہر اور دین بے زاری کے سینکڑوں عناصر وتحریکات پر قابو پایا جاسکتا ہے، اس لئے اس پہلو کی طرف خاطر خواہ توجہ دی جائے اور اللہ تعالیٰ کا بہت ہی فضل وکرم ہے کہ ہماری روسیاہیوں، حد درجہ کوتاہیوں اور طرح طرح کی خامیوں کے باوجود ابھی تک یہ امت بانجھ نہیں ہے، اس میں ملی درد وغم رکھنے میں اور اس غم میں بے تاب ہونے والے افراد گو مجموعی لحاظ سے کم ہے لیکن جو کچھ ہیں وہ بھی خدا تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت ہے، وہ اگر اپنی استطاعت کی حد تک اجتماعی طور پر اس کے لئے کوئی سبیل نکالنا چاہے تو امید ہے کہ کوئی قابلِ ذکر رکاوٹ پیش نہیں آئے گی اور کچھ ہی عرصہ بعد اس کے بہت کچھ اچھے نتائج اور بہتر ثمرات دیکھنے کو مل سکیں گے ان شاء اللہ۔

۶: تعلیم وغیرہ تمام نظاموں کا اصل سرچشمہ ریاست وحکومت ہے، اس کی اصلاح کروڑں لوگوں کی اصلاح اور اس کا فساد وگمراہی کروڑوں افراد کے فساد وگمراہی کا باعث بلکہ شاید اس کا مترادف ہے، ریاستی سطح پر جب تک بے دینی اور دین بے زاری کی فضاء برقرار ہو تو انفرادی کوششیں کچھ زیادہ پائیدار ثابت نہیں ہوتی، اس لئے اس باب میں بھی اپنی قدرت واستطاعت خرچ کرنے میں کوئی دریغ نہیں کرنا چاہئے اور ریاستی ڈھانچے کی اصلاح کو اولین ترجیحات میں سے مقرر کرلینا چاہئے۔

۷:جو بنیاد کی تعمیر کرے، وہی اصل معمار کہلانے کا زیادہ مستحق ہے، باقی رنگ وروغن وغیرہ چیزیں عمارت استوار ہونے پر ہی موقوف ہے۔ موجودہ حالات میں دین کی خدمت جس صورت میں بھی اور جس قدر بھی نصیب ہو تو یہ بڑی سعادت کی بات ہے ، تاہم زیادہ توجہ طلب خدمت یہی ہے کہ ان بنیادوں کی تعمیر پر محنت کی جائے جس پر دین اور دین داری کے ستون کھڑے ہوتے ہیں اور وہ یہی ہے کہ دین داری کی قدر وقیمت، انسانی زندگی میں اس کی غیر معمولی ضرورت واہمیت مسلمانوں کے دلوں میں بٹھائی جائے، ایمانیات یعنی اللہ تعالیٰ، اس کے رسولوں، کتابوں اور روزِ آخرت پر ایمان ویقین کی خوب محنت کی جائے۔ دل ودیوار کی کمزوری عموماً بنیادوں کی کمزوری سے پیدا ہوتی ہے۔ ایمانیات مضبوط ہو تو ایسے افراد ومعاشروں کو کوئی آندھی طوفان اپنی نظریاتی حدود سے ہٹا یا ہلا نہیں سکتی۔ بنیادوں کے اس استحکام ورسوخ میں تصوف وسلوک کے ازکار واشغال کا بھی بہت کچھ کردار ہے، لیکن کاش اس کی کوئی منظم اور بدعات ورسوم سے محفوظ ومامون صورت رائج ہو جائے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

مصادر و مراجع

- أدب المجالسة وحمد اللسان،: المؤلف: أبو عمر يوسف القرطبي (المتوفى: ۴۶۳ھ)
- اسباب زوال امت: شیخ شکیب ارسلان، دعوۃ اکیڈمی بین الاقوامی یونیورسٹی اسلام آباد
- اسلام اور اکیسویں صدی کا چیلنج: جناب اسرار عالم صاحب، دار العلم نئی دہلی
- اسلام اور جدید ذہن کے شبہات: شیخ محمد قطب، ترجمہ: محمد سلیم کیانی، البدر پبلی کیشنز
- اسلام اور جدید نظام سیاست و حکومت: مفتی عبید الرحمان، مردان
- الاسلام علی مفترق الطرق۔ محمد أسد۔ دار العلم للملایین
- الاسلام والغرب، دکتور محمد سعید رمضان البوطی، دار الفکر
- اسلامی ریاست: مولانا سید ابو الاعلی مودودی
- امر بالمعروف اور نہی عن المنکر۔ مفتی عبید الرحمان، مردان
- انسان، مادہ پرستی اور اسلام: مفتی ابو احمد عبد اللہ لدھیانوی، مطاف پبلی کیشنز گوجرانوالہ
- انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج وزوال کا اثر: مولانا ابو الحسن علی ندوی، مجلس نشریات اسلام کراچی
- البحر الرائق شرح كنز الدقائق: زين الدين ابن نجيم المصري (المتوفى: ۹۷۰ھ الناشر: دار الكتاب الاسلامي۔
- تاج العروس: محمّد مرتضى، الزبيدي (المتوفى: ۱۲۰۵ھ)
- تفسير القرآن العظيم: أبو الفداء إسماعيل بن كثير (المتوفى: ۷۷۴ھ)
- جدیدیت: جناب حسن عسکری، عکس پبلی کیشنز
- حجۃ اللہ البالغۃ: حضرت امام شاہ ولی اللہ صاحب دہلوی
- حیات جاوید: مولانا الطاف حسین حالی
- خطبات علی میاں: مولانا ابو الحسن علی ندوی، دار الاشاعت اردو بازار
- الدين: بحوث ممهدة لدراسة تاريخ الاديان، علامہ عبد اللہ دراز
- زاد المسير في علم التفسير: جمال الدين أبو الفرج عبد الرحمن بن محمد الجوزي (المتوفى: ۵۹۷ھ)
- سنن أبي داود: أبو داود سليمان بن الأشعث الأزدي السِّجِستاني (المتوفى: ۲۷۵ھ)
- صحيح البخاري: محمد بن إسماعيل أبو عبد الله البخاري الجعفي
- عبقات: مولانا شاہ اسماعیل شہید، ادارہ اسلامیات، لاہور
- علم الأديان تاريخه، مكوناته ومناهجه: خزعل ماجدي دار المؤمنون للدراسات والابحاث

تصانیفِ حضرت مولانا مفتی عبید الرحمن صاحب زید مجدہم

علوم قرآن

اصولِ تفسیر

علوم حدیث

تکملہ منہاج السنن شرح جامع السنن للترمذی

فقہ، علوم فقہ، فتاویٰ

احکامِ مدارس

احکامِ مزارعت

علمی وفقہی مضامین (دو سو علمی وفقہی مقالات ومضامین)

عملیات کی عصری صورتیں: شرعی فقہی تناظر میں

غیر مسلم کے ساتھ تعلقات

فقہ البدعۃ فی الشریعۃ الاسلامیۃ (عربی)

فتاوی رحمانیہ

تجارتی سود اور کرنسی کے مسائل

تحکیم اور جرگہ: اہمیت وضرورت اور طریقہ کار

مبیع میں کمی زیادتی کا تحقیقی مطالعہ

الرشوۃ واحکامہا فی الفقہ الاسلامی (عربی)

سرکاری قوانین اور عدالتی فیصلوں کا شرعی دائرہ کار

قتلِ مسلم، اسباب وموجبات، مسائل واحکام

مشترکہ خاندانی نظام

مروجہ حرام ذرائع آمدن

حلال وحرام مشہور ب "عطرِ ہدایہ" (تحقیق وتخریج)

اسلام اور بین الاقوامی تعلقات

حاشیہ کفایت المفتی

المکالمات والمراسلات العلمیۃ والفقہیۃ

عقائد وعلم کلام

اصولِ تکفیر

مسئلہ توحید وشرک

تفرقِ امت کا قضیہ اور اہل سنت کا معیار ومصداق

اصول واحکامِ تضلیل

شرح العقیدۃ الطحاویۃ (عربی)

مبادیات علم الکلام

شرح وتکملہ انتباہات مفیدہ

نظام سیاست وحکومت

اسلام اور جدید نظام سیاست وحکومت

اسلام اور جدید سیاسی مسائل

عالمی "انسانی حقوق" کا فقہی جائزہ

اصولِ فقہ

قواعد اصول الفقہ (عربی)

سبیل الوصول الی زبدۃ الاصول (عربی)

فقہ حنفی کے چند ذیلی مصادر اور ان کا اصولی جائزہ

مقاصد شریعت: ایک اصولی جائزہ

ضعیف احادیث: شرعی واصولی مطالعہ

شرح مختصر اصول فقہ

اصولِ افتاء: اہم عصری مباحث

دلیل واستدلال کے اسالیب اور عقل ونقل کا شرعی مقام

تصوف واصلاح

علم سلوک وتصوف: اہمیت وضرورت، مبادی ومقاصد

عبادات میں خشوع واستحضار، اہمیت وطریقہ کار

مشائخ طریقت کے دربار میں

فضیلت وافضلیت: مفہوم، اسباب اور غلطیاں

فکرِ اسلامی اور اصلاحِ معاشرہ

کبیرہ گناہ

فتنے: مفہوم ومصداق اور حفاظتی نصاب

معمولاتِ صالحین

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر

اصلاحی ومعاشرتی مضامین

دین ومذہب: تعارف واہمیت، عصری شبہات کا منصفانہ جائزہ

فضائلِ اخلاق

علم اور علماء: تعارف اہمیت اور تقاضے

براہین قاطعہ بجواب انوار ساطعہ (محقق، مخرج) مولانا عادل رضا صاحب
الفتاوی الکاملیہ (محقق مخرج) مولانا سبحان اللہ صاحب

مکتبہ دار التقویٰ مردان
0300-9326101,0314-3017364

میزان پرنٹرز محلہ جنگی قصہ خوانی بازار پشاور شہر 0334-8696969